برج موہن کے نام

○ میں اُسے واحد ایسا ادیب اور افسانہ نگار سمجھتا رہا ہوں جس میں فن اور زبان کا برابر امتزاج ہے
راجندر سنگھ بیدی

○ منٹو!..... خدا تیرے قلم میں اور زیادہ برکت دے
کرشن چندر

○ اگر مستقبل میں کوئی غیر جانب دار نقاد منٹو اور مشرق وسطیٰ کے افسانہ نگاروں کی تخلیقات کا تجزیہ کرنے بیٹھے گا تو بخدا منٹو کو پاکستان اور ہندوستان ہی کا نہیں پورے مشرق وسطیٰ کا سب سے بڑا فن کار قرار دینے پر مجبور ہوگا۔
رشید اختر ندوی

○ منٹو اپنے سوا کسی کو شاذ ہی مانتے تھے۔ وہ اپنے آپ کو برصغیر کا سب سے بڑا افسانہ نگار مانتے تھے ـــ ان کا دعویٰ کسی حد تک درست تھا۔
شورش کاشمیری

○ منٹو تو ادب کے علاوہ عمر بھر اپنی زندگی میں فنکاری کے شعبدے دکھاتا رہا۔ شراب بے تحاشہ پیتا رہا ـــ مقدمے اُس پر چلے۔ پاگل خانے تک جا پہنچا۔ برصغیر میں ادب کا جو "انڈر ورلڈ" ہے اس کا وہ عمدہ مصور تھا۔ تعجب ہے کہ اس کو TOUDAURE - LAUTREC سے کیوں تشبیہ نہیں دی گئی۔
قرۃ العین حیدر

○ منٹو اگر الگ ہے تو کوئی جماعت لوگوں کی نظر میں ادیبوں کی نمائندہ نہیں بن سکتی۔
محمد حسن عسکری

○ منٹو اپنے پیچھے بہت کچھ چھوڑ گیا ہے جو ادبی دنیا میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔
ممتاز شیریں

○ منٹو پاکستان اور ہندوستان کی ان چند شخصیتوں میں سے ایک ہے جو مر بھی گئے اور نہیں بھی مرے! اسلئے اس کو ہمیشہ کے لئے خدا حافظ کہنے کو جی نہیں چاہتا۔

ابراھیم جلیس

○ منٹو ایسا نڈر، بے باک، صاف گو افسانہ نگار آج تک اُردو ادب نے پیدا نہیں کیا۔ اور اُس کی موت سے اُردو کا افسانوی ادب مفلس ہو گیا۔

شاھد احمد دھلوی

○ منٹو کا فن اور نقطۂ نظر ہمیشہ اُردو ادب کے پرستاروں میں بحث کا موضوع بنا رہے گا۔ لیکن ایک بات پر سب متفق ہیں کہ وہ بہت عظیم افسانہ نگار تھا۔

سید احتشام حسین

○ منٹو کے انتخاب موضوع کے اختلاف کے باوجود میرے نزدیک وہ بہت بڑا فن کار تھا۔

علی عباس حسینی

○ منٹو عہد حاضر کے افسانہ نگاروں کا ذہنی اور تخلیقی رہنما تھا۔

سید ابوالخیر کشفی

○ منٹو ہمیشہ زندہ رہے گا، اپنی تخلیقات کی وجہ سے۔ منٹو وقت اور زمانے کی دست برد سے بالاتر ہو چکا ہے۔

ممتاز مفتی

○ منٹو کا لفظ اب ایک اسم صفت بن گیا ہے اب یہ لفظ ایک خاص ادبی رجحان یا شخصیت کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے۔

حامد جلال

بادشاہت کا خاتمہ

سعادت حسن منٹو

ساقی بک ڈپو۔ دہلی

ترتیب

مضمون	صفحہ
بادشاہت کا خاتمہ	۹
تقی کاتب	۲۷
والد صاحب	۴۴
عورت ذات	۵۷
عشق حقیقی	۶۹
کُتّے کی دعا	۸۲
پری	۹۵
خود فریب	۱۰۷
برمی لڑکی	۱۰۹
فوبھا بائی	۱۳۶
ابجی ڈڈو	۱۵۱

پیش لفظ

مجھے ان افسانوں کے متعلق صرف یہ کہنا ہے کہ یہ میرے افسانے ہیں۔ ان کی خوبی علاوہ اس کے کہ یہ میرے ہیں یہ ہے کہ یہ بہت مختصر عرصے میں سپردِ قلم ہوئے ہیں۔ جن حالات میں یہ لکھے گئے اس کا حال میں جانتا ہوں، یا میرا خدا، جو بڑا بے نیاز ہے۔

ہر افسانے کے اختتام پر ایک تاریخ درج ہے جو بتاتی ہے کہ افسانہ کب لکھا گیا۔ ان تاریخوں سے آپ کو معلوم ہو سکتا ہے کہ میں نے یہ مجموعہ مجموعی طور پر کتنے عرصے میں تیار کیا۔ صاحبِ نظر قارئین اس تاریخی مجموعے سے میرے ذہن کے متعلق ایک خاص عرصے کی حد تک اپنے اپنے خیال کے مطابق رائے ضرور قائم کر سکیں گے۔

ان افسانوں میں ایک خوبی یا برائی یہ بھی ہے کہ ان کی طوالت قریب قریب یکساں ہے یہ میں نے افسانہ نگاری میں ایک نیا تجربہ کیا ہے۔ اس کے متعلق میں ناقدینِ فن کی رائے بڑی دلچسپی سے پڑھوں اور سنوں گا۔

اور کچھ کہنا نہیں چاہتا سوائے اس کے کہ پاکستان میں ابھی تک زندہ ہوں،

سعادت حسن منٹو

۱۴ر جون ۱۹۵۰ء

بادشاہت کا خاتمہ

ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ من موہن پاس ہی بیٹھا تھا۔ اس نے ریسیور اٹھایا اور کہا۔ "ہیلو۔ فور فور فور فائیو سیون"

دوسری طرف سے پتلی سی نسوانی آواز آئی "سوری۔ رونگ نمبر"۔

من موہن نے ریسیور رکھ دیا اور کتاب پڑھنے میں مشغول ہو گیا۔

یہ کتاب وہ تقریباً بیس مرتبہ پڑھ چکا تھا۔ اس لئے نہیں کہ اس میں کوئی خاص بات تھی، دفتر میں جو ویران پڑا تھا۔ ایک صرف یہی کتاب تھی۔ جس کے آخری اوراق کرم خوردہ تھے،

ایک ہفتے سے دفتر من موہن کی تحویل میں تھا۔ کیونکہ اس کا مالک جو کہ اس کا دوست تھا۔ کچھ روپیہ قرض لینے کے لئے کہیں باہر گیا ہوا تھا۔

من موہن کے پاس چونکہ رہنے کے لئے کوئی جگہ نہیں تھی۔ اس لئے فٹ پاتھ سے عارضی طور پر وہ اس دفتر میں منتقل ہو گیا تھا۔ اور اس ایک ہفتے میں وہ دفتر کی اکلوتی کتاب تقریباً بیس مرتبہ پڑھ چکا تھا۔

دفتر میں وہ اکیلا پڑا رہتا۔ نوکری سے اُسے نفرت تھی۔ اگر وہ چاہتا تو کسی بھی فلم کمپنی میں بطور فلم ڈائرکٹر کے ملازم ہو سکتا تھا۔ مگر وہ غلامی نہیں چاہتا تھا۔ نہایت ہی بے ضرر اور مخلص آدمی تھا۔ اِس لئے دوست یار اس کے روزانہ اخراجات کا بندوبست کر دیتے تھے۔ یہ اخراجات بہت ہی کم تھے۔ صبح کو چار کی پیالی اور دو توس، دوپہر کو دو پھلکے اور تھوڑا سا سالن سارے دن میں ایک پیکٹ سگریٹ اور بس۔

من موہن کا کوئی عزیز یا رشتے دار نہیں تھا۔ بے حد خاموشی پسند تھا۔ جفاکش تھا۔ کئی کئی دن فاقے سے رہ سکتا تھا۔ اس کے متعلق اس کے دوست اور تو کچھ نہیں لیکن اتنا جانتے تھے کہ وہ بچپن ہی سے گھر چھوڑ چھاڑ کر نکل آیا تھا۔ اور ایک مدت سے بمبئی کے فٹ پاتھوں پر آباد تھا۔ زندگی میں صرف اس کو ایک چیز کی حسرت تھی۔ عورت کی محبت کی۔ وہ کہا کرتا تھا۔ اگر مجھے کسی عورت کی محبت مل گئی تو میری ساری زندگی بدل جائے گی۔

دوست اُس سے کہتے "تم کام پھر بھی نہ کرو گے۔"

من موہن آہ بھر کر جواب دیتا "کام؟ میں مجسم کام بن جاؤں گا۔"

دوست کہتے "تو شروع کر دو کسی سے عشق۔"

من موہن جواب دیتا "نہیں۔ میں ایسے عشق کا قائل نہیں جو مرد کی طرف سے شروع ہو۔"

دوپہر کے کھانے کا وقت قریب آرہا تھا۔ من موہن نے سامنے دیوار پہ کلاک کی طرف دیکھا۔ ٹیلی فون کی گھنٹی بجنا شروع ہوئی۔ اس نے ریسیور اٹھایا اور کہا "ہیلو۔ فور فور فور فائیو سیون"

دوسری طرف سے پتلی سی آواز آئی "فور فور فور فائیو سیون؟"

برج موہن نے جواب دیا "جی ہاں"

نسوانی آواز نے پوچھا "آپ کون ہیں؟"

"میں من موہن!۔ فرمائیے!"

دوسری طرف سے آواز نہ آئی تو من موہن نے کہا "فرمائیے کس سے بات کرنا چاہتی ہیں آپ؟"

آواز نے جواب دیا "آپ سے"

من موہن نے ذرا حیرت سے پوچھا "مجھ سے؟"

"جی ہاں۔ آپ سے، کیا آپ کو کوئی اعتراض ہے"

من موہن سٹپٹا سا گیا "جی؟۔ جی نہیں!"

آواز مسکرائی "آپ نے اپنا نام مدن موہن بتایا تھا"

"جی نہیں۔ من موہن"

"من موہن!"

چند لمحات خاموشی میں گذر گئے تو من موہن نے کہا "آپ باتیں کرنا چاہتی تھیں

مجھ سے؟"

آواز آئی "جی ہاں"

"تو کیجئے!"

تھوڑے وقفے کے بعد آواز آئی "سمجھ میں نہیں آتا کیا بات کروں۔ آپ ہی شروع کیجئے نہ کوئی بات۔"

"بہت بہتر" یہ کہہ کر من موہن نے تھوڑی دیر سوچا "نام اپنا بتا چکا ہوں۔ عارضی طور پر ٹھکانا میرا یہ دفتر ہے۔ پہلے فرش پر سوتا تھا۔ اب ایک ہفتے سے اس دفتر کے بڑے میز پر سوتا ہوں۔"

آواز مسکرائی "فٹ پاتھ پر آپ مسہری لگا کر سوتے تھے؟"

من موہن ہنسا "اس سے پہلے کہ میں آپ سے مزید گفتگو کروں۔ میں یہ بات واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا فٹ پاتھ پر سوتے مجھے ایک زمانہ ہو گیا ہے، یہ دفتر تقریباً ایک ہفتے سے میرے قبضے میں ہے آج کل عیش کر رہا ہوں؟"

آواز مسکرائی "کیسے عیش؟"

من موہن نے جواب دیا "ایک کتاب مل گئی تھی یہاں سے آخری اوراق گم ہیں۔ لیکن میں اسے بیس مرتبہ پڑھ چکا ہوں۔ سالم کتاب کبھی ہاتھ لگی تو معلوم ہو گا ہیرو ہیروئن کے عشق کا انجام کیا ہوا۔"

آواز ہنسی۔ آپ بڑے دلچسپ آدمی ہیں۔"

من موہن نے تکلف سے کہا "آپ کی ذرہ نوازی ہے۔"

آواز نے تھوڑے توقف کے بعد پوچھا: "آپ کا شغل کیا ہے؟"

"شغل؟"

"میرا مطلب ہے آپ کرتے کیا ہیں؟"

"کیا کرتا ہوں؟ کچھ بھی نہیں۔ ایک بیکار انسان کیا کر سکتا ہے۔ سارا دن آوارہ گردی کرتا ہوں رات کو سو جاتا ہوں۔"

آواز نے پوچھا: "یہ زندگی آپ کو اچھی لگتی ہے؟"

من موہن سوچنے لگا: "ٹھہریئے۔ بات دراصل یہ ہے کہ میں نے اس پہ کبھی غور نہیں کیا۔ اب آپ نے پوچھا ہے تو میں اپنے آپ سے پوچھ رہا ہوں کہ یہ زندگی تمہیں اچھی لگتی ہے یا نہیں؟

"کوئی جواب ملا؟"

تھوڑے وقفے کے بعد من موہن نے جواب دیا: "جی نہیں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ ایسی زندگی مجھے اچھی لگتی ہی ہوگی جب کہ ایک عرصے سے بسر کر رہا ہوں۔"

آواز ہنسی۔ من موہن نے: "آپ کی ہنسی بڑی مترنم ہے۔"

آواز شرما گئی: "شکریہ!" اور سلسلۂ گفتگو منقطع کر دیا۔

من موہن تھوڑی دیر ریسیور ہاتھ میں لئے کھڑا رہا۔ پھر مسکرا کر اسے رکھ دیا اور دفتر بند کر کے چلا گیا۔

دوسرے روز صبح آٹھ بجے جب کہ من موہن دفتر کے بڑے میز پر سو رہا تھا۔ ٹیلیفون کی گھنٹی بجنا شروع ہوئی۔ جمائیاں لیتے ہوئے اس نے ریسیور اٹھایا اور کہا۔

"ہلو فور فور فور فائیو سیون"

دوسری طرف سے آواز آئی "آداب عرض من موہن صاحب!"

"آداب عرض!" من موہن ایک دم چونکا "اوہ آپ۔ آداب عرض تسلیمات"

آواز آئی "آپ غالباً سو رہے تھے؟"

"جی ہاں۔ یہاں آکر میری عادات کچھ بگڑ رہی ہیں۔ واپس فٹ پاتھ پر گیا تو بڑی مصیبت ہو جائے گی"

آواز مسکرائی "کیوں"

"وہاں صبح پانچ بجے سے پہلے پہلے اٹھنا پڑتا ہے"

آواز ہنسی۔ من موہن نے پوچھا "کل آپ نے ایکدم ٹیلیفون بند کر دیا"

آواز شرمائی "آپ نے میری ہنسی کی تعریف کیوں کی تھی"

من موہن نے کہا "لو صاحب، یہ بھی عجیب بات کہی آپ نے کوئی چیز خوبصورت ہو تو اس کی تعریف نہیں کرنی چاہیئے؟"

"بالکل نہیں!"

"یہ شرط آپ مجھ پر عاید نہیں کر سکتیں۔ میں نے آج تک کوئی شرط اپنے اوپر عاید نہیں ہونے دی۔ آپ ہنسیں گی تو میں ضرور تعریف کروں گا"

"میں ٹیلیفون بند کر دوں گی"

"بڑے شوق سے"

"آپ کو میری ناراضگی کا کوئی خیال نہیں"

"میں سب سے پہلے اپنے آپ کو ناراض نہیں کرنا چاہتا۔ اگر میں آپ کی

ہنسی کی تعریف نہ کروں تو میرا ذوق مجھ سے ناراض ہو جائے گا۔ یہ ذوق مجھے بہت عزیز ہے!"

تھوڑی دیر خاموشی رہی اس کے بعد دوسری طرف سے آواز آئی: "معاف کیجئے گا۔ میں ملازمہ سے کچھ کہہ رہی تھی۔ آپ کا ذوق آپ کو بہت عزیز ہے... ۔۔ ہاں یہ تو بتائیے آپ کو شوق کس چیز کا ہے؟"

"کیا مطلب؟"

"یعنی۔ کوئی شغل۔ کوئی کام۔۔ میرا مطلب ہے آپ کو آتا کیا ہے؟"

من موہن ہنسا۔ کوئی کام نہیں آتا۔ فوٹو گرافی کا تھوڑا سا شوق ہے"

"بہت اچھا شوق ہے"

"اس کی اچھائی یا برائی کا میں نے کبھی نہیں سوچا"

آواز نے پوچھا: "کیمرہ تو آپ کے پاس بہت اچھا ہو گا؟"

من موہن ہنسا: "میرے پاس اپنا کوئی کیمرہ نہیں۔ دوستوں سے مانگ کر شوق پورا کر لیتا ہوں۔ اگر میں نے کبھی کچھ کمایا تو ایک کیمرہ میری نظر میں ہے۔ وہ خریدوں گا"

آواز نے پوچھا: "کون سا کیمرہ؟"

من موہن نے جواب دیا: "ایگزکٹا ریفلکس کیمرہ ہے مجھے بہت پسند ہے"

تھوڑی دیر خاموشی رہی، اس کے بعد آواز آئی: "میں کچھ سوچ رہی تھی"

"کیا؟"

"آپ نے میرا نام پوچھا، نہ ٹیلیفون نمبر دریافت کیا"

"مجھے اس کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی؟"

"کیوں؟"

"نام آپ کا کچھ ہی ہو کیا فرق پڑتا ہے۔ آپ کو میرا نمبر معلوم ہے بس ٹھیک ہے۔ آپ گر چاہیں گی کہ میں آپکو ٹیلیفون کروں تو نام اور نمبر بتا دیجئے گا۔"

"میں نہیں بتاؤں گی۔"

"لو صاحب یہ بھی خوب رہا۔ میں جب آپ سے پوچھوں گا ہی نہیں تو بتانے نہ بتانے کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے۔"

آواز مسکرائی "آپ عجیب و غریب آدمی ہیں۔"

من موہن مسکرایا "جی ہاں کچھ ایسا ہی آدمی ہوں۔"

چند سیکنڈ خاموشی رہی "آپ پھر سوچنے لگیں۔"

"جی ہاں، کوئی اور بات اس وقت سوجھ نہیں رہی تھی۔"

"تو ٹیلی فون بند کر دیجئے۔ پھر سہی"

آواز کسی قدر تیکھی ہو گئی "آپ بہت روکھے آدمی ہیں ٹیلیفون بند کر دیجئے لیجئے میں بند کرتی ہوں۔"

من موہن نے ریسیور رکھ دیا اور مسکرانے لگا۔

آدھے گھنٹے کے بعد من موہن ہاتھ منہ دھو کر کپڑے پہن کر باہر نکلنے کے لئے تیار ہوا تو ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے ریسیور اٹھایا اور کہا "فور فور فور فائیو سیون!"

آواز آئی "مسٹر من موہن۔"

من موہن نے جواب دیا "جی ہاں من موہن۔ ارشاد؟"

آواز مسکرائی "ارشاد یہ ہے کہ میری ناراضگی دور ہو گئی ہے۔"

من موہن نے بڑی شگفتگی سے کہا "مجھے بڑی خوشی ہوئی ہے۔"

"ناشتہ کرتے ہوئے مجھے خیال آیا کہ آپ کے ساتھ بگاڑنی نہیں چاہئے ہاں آپ نے ناشتہ کر لیا۔"

"جی نہیں، باہر نکلنے ہی والا تھا کہ آپ نے ٹیلیفون کیا۔"

"اوہ — تو آپ جائیے۔"

"جی نہیں مجھے کوئی جلدی نہیں میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔ اس لئے میرا خیال ہے کہ آج ناشتہ نہیں ہوگا۔"

"آپ کی باتیں سن کر۔ آپ ایسی باتیں کیوں کرتے ہیں۔ میرا مطلب ہے ایسی باتیں آپ اس لئے کرتے ہیں کہ آپ کو دکھ ہوتا ہے؟"

من موہن نے ایک لمحہ سوچا "جی نہیں۔ میرا اگر کوئی دکھ درد ہے تو میں اس کا عادی ہو چکا ہوں۔"

آواز نے پوچھا "میں کچھ روپے آپ کو بھیج دوں؟"

من موہن نے جواب دیا "بھیج دیجئے۔ میرے فنانسروں میں ایک آپ کا بھی اضافہ ہو جائے گا؟"

"نہیں میں نہیں بھیجوں گی۔"

"آپ کی مرضی!"

میں ٹیلی فون بند کرتی ہوں۔"

"بہتر۔"

من موہن نے ریسیور رکھ دیا اور مسکراتا ہوا دفتر سے نکل گیا۔ رات کو دس بجے

کے قریب واپس آیا اور کپڑے بدل کر میز پہ لیٹ کر سوچنے لگا کہ یہ کون ہے جو اسے فون کرتی ہے، آواز سے صرف اتنا پتہ چلتا تھا کہ جوان ہے، ہنسی بہت ہی مترنم تھی۔ گفتگو سے یہ صاف ظاہر ہے کہ تعلیم یافتہ اور مہذب ہے بہت دیر تک وہ اس کے متعلق سوچتا رہا۔ ادھر کلاک نے گیارہ بجائے۔ اُدھر ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ من موہن نے ریسیور اُٹھایا۔ "ہیلو!"

دوسری طرف سے آواز آئی۔ "مسٹر من موہن"

"جی ہاں۔ من موہن۔ ارشاد"

"ارشاد یہ ہے کہ میں نے آج دن میں کئی مرتبہ رنگ کیا۔ آپ کہاں غائب تھے؟"

"صاحب بیکار ہوں، لیکن پھر بھی کام پر جاتا ہوں"

"کس کام پر"

"آوارہ گردی"

"واپس کب آئے؟"

"دس بجے"

"اب کیا کر رہے تھے؟"

"میز پر لیٹا آپ کی تصویر بنا رہا تھا"

"بنی؟"

"جی نہیں"

"بنانے کی کوشش نہ کیجئے۔ میں بڑی بدصورت ہوں"

"معاف کیجئے گا، اگر آپ واقعی بدصورت ہیں تو ٹیلیفون بند کر دیجئے۔

بدصورتی سے مجھے نفرت ہے۔"

آواز مسکرائی "ایسا ہے تو چلئے میں خوبصورت ہوں۔ میں آپ کے دل میں نفرت نہیں پیدا کرنا چاہتی۔"

تھوڑی دیر خاموشی رہی۔ من موہن نے پوچھا "کچھ سوچنے لگیں؟"

آواز چونکی "جی نہیں۔ میں آپ سے پوچھنے والی تھی کہ۔۔۔"

"سوچ لیجئے اچھی طرح۔"

آواز ہنس پڑی "آپ کو گانا سناؤں؟"

"ضرور!"

"ٹھہریئے۔"

گلا صاف کرنے کی آواز آئی۔ پھر غالب کی یہ غزل شروع ہوئی ؎

نکتہ چیں ہے غم دل۔۔۔

سہگل والی نئی دھن تھی۔ آواز میں درد اور خلوص تھا۔ جب غزل ختم ہوئی تو من موہن نے داد دی "بہت خوب۔ زندہ رہو۔"

آواز شرما گئی "شکریہ" اور ٹیلیفون بند کر دیا۔

دفتر کے بڑے میز پر من موہن کے دل و دماغ میں ساری رات غالب کی غزل گونجتی رہی۔ صبح جلدی اٹھا اور ٹیلیفون کا انتظار کرنے لگا۔ تقریباً ڈھائی گھنٹے کرسی پر بیٹھا رہا مگر ٹیلیفون کی گھنٹی نہ بجی۔ جب مایوس ہو گیا تو ایک عجیب سی تلخی اس نے اپنے حلق میں محسوس کی۔ اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ اس کے بعد میز پر لیٹ گیا اور کڑھنے لگا۔ وہی کتاب جس کو وہ متعدد مرتبہ پڑھ چکا تھا اٹھائی اور ورق گردانی شروع کر دی۔

یونہی لیٹے لیٹے شام ہوگئی۔ تقریباً سات بجے ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ من موہن نے ریسیور اٹھایا اور تیزی سے پوچھا۔۔۔ "کون ہے؟"

وہی آواز آئی "میں!"

من موہن کا لہجہ تیز رہا۔ "اتنی دیر تم کہاں تھیں؟"

آواز لرزی۔ "کیوں؟"

"میں صبح سے یہاں جھک مار رہا ہوں۔ ناشتہ کیا ہے نہ دوپہر کا کھانا کھایا ہے، حالانکہ میرے پاس پیسے موجود تھے۔"

آواز آئی "میری جب مرضی ہوگی ٹیلیفون کروں گی۔ آپ۔۔۔"

من موہن نے بات کاٹ کر کہا "دیکھو جی یہ سلسلہ بند کرو۔ ٹیلیفون کرنا ہے تو ایک وقت مقرر کرو۔ مجھ سے انتظار برداشت نہیں ہوتا۔"

آواز مسکرائی "آج کی معافی چاہتی ہوں۔ کل سے باقاعدہ صبح و شام فون آیا کرے گا، آپ کو۔"

"یہ ٹھیک ہے!"

آواز ہنسی "مجھے معلوم نہیں تھا آپ اس قدر بگڑے دل ہیں۔"

من موہن مسکرایا "معاف کرنا انتظار سے مجھے بہت بہت کوفت ہوتی ہے اور جب مجھے کسی بات سے کوفت ہوتی ہے تو اپنے آپ کو سزا دینا شروع کر دیتا ہوں۔"

"وہ کیسے؟"

"صبح تمہارا ٹیلیفون نہ آیا۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ میں چلا جاتا۔ لیکن

بیٹھا دن بھر اندر ہی اندر کڑھتا رہا۔ پچھتا ہے صاف یہ
آواز ہمدردی میں ڈوب گئی۔ کاش مجھ سے یہ غلطی نہ ہوتی۔ میں نے
قصداً صبح ٹیلیفون نہ کیا!"

"کیوں؟"

"یہ معلوم کرنے کے لئے کہ آپ انتظار کریں گے یا نہیں؟"

من موہن ہنسا "بہت شریر ہو تم۔ اچھا اب ٹیلیفون بند کرو۔
میں کھانا کھانے جا رہا ہوں۔"

"بہتر کب تک لوٹئے گا؟"

آدھے گھنٹے تک۔"

من موہن آدھے گھنٹے کے بعد کھانا کھا کر لوٹا تو اس نے فون کیا۔ دیر تک
دونوں باتیں کرتے رہے۔ اس کے بعد اس نے غالب کی ایک غزل سنائی۔ من موہن
نے دل سے داد دی۔ پھر ٹیلیفون کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔

اب ہر روز صبح و شام من موہن کو اس کا ٹیلیفون آتا۔ گھنٹی کی آواز
سنتے ہی وہ ٹیلیفون کی طرف لپکتا۔ بعض اوقات گھنٹوں باتیں جاری رہتیں۔
اس دوران میں من موہن نے اس سے ٹیلیفون کا نمبر پوچھا نہ اس کا نام۔ شروع
شروع میں اس کی آواز کی مدد سے تخیل کے پردے پر اس کی تصویر کھینچنے
کی کوشش کی تھی۔ مگر اب وہ جیسے آواز ہی سے مطمئن ہو گیا تھا۔ آواز ہی شکل تھی۔
آواز ہی صورت تھی، آواز ہی جسم تھا۔ آواز ہی روح تھی۔ ایک دن اس نے
پوچھا "من موہن! تم میرا نام کیوں نہیں پوچھتے؟"

من موہن نے مسکرا کر کہا "تمہارا نام تمہاری آواز ہے"

"جو کہ بہت ترنّم ہے"

"اس میں کیا شک ہے؟"

ایک دن وہ بڑا ٹیڑھا سوال کر بیٹھی موہن تم نے کبھی کسی لڑکی سے محبت کی ہے؟"

من موہن نے جواب دیا "نہیں"

"کیوں؟"

موہن ایک دم اداس ہو گیا "اس کیوں کا جواب چند لفظوں میں نہیں دے سکتا۔ مجھے اپنی زندگی کا سارا ملبہ اُٹھانا پڑے گا۔ اگر کوئی جواب نہ ملے تو بڑی کوفت ہو گی"

"جانے دیجئے"

ٹیلیفون کا رشتہ قائم ہوئے تقریباً ایک مہینہ ہو گیا۔ بلاناغہ دن میں دو مرتبہ اس کا فون آتا۔ من موہن کو اپنے دوست کا خط آیا کہ قرضے کا بندوبست ہو گیا ہے سات آٹھ روز میں وہ بمبئی پہنچنے والا ہے۔ من موہن یہ خط پڑھ کر افسردہ ہو گیا۔ اس کا ٹیلیفون آیا تو من موہن نے اس سے کہا "میری دفتر کی بادشاہی اب چند دنوں کی مہمان ہے۔"

اس نے پوچھا "کیوں؟"

من موہن نے جواب دیا "قرضے کا بندوبست ہو گیا ہے۔ دفتر آباد ہونے والا ہے۔"

"تمہارے کسی اور دوست کے گھر ٹیلیفون نہیں"

"کئی دوست ہیں جن کے ٹیلیفون ہیں۔ مگر میں تمہیں ان کا نمبر نہیں دے سکتا۔"

"کیوں؟"

"میں نہیں چاہتا تمہاری آواز کوئی اور سُنے۔"

"وجہ؟"

"میں بہت حاسد ہوں۔"

وہ مُسکرائی۔ "یہ تو بڑی مصیبت ہوئی۔"

"کیا کیا جائے؟"

"آخری دن جب تمہاری بادشاہت ختم ہونے والی ہوگی، میں تمہیں اپنا نمبر بتا دوں گی۔"

"یہ ٹھیک ہے۔"

من موہن کی ساری افسردگی دور ہو گئی۔ وہ اس دن کا انتظار کرنے لگا کہ دفتر میں اُس کی بادشاہت ختم ہو۔ اب پھر اس نے اس کی آواز کی مدد سے اپنے تخیّل کے پردے پر اس کی تصویر کھینچنے کی کوشش شروع کی۔ کئی تصویریں بنیں، مگر وہ مطمئن نہ ہوا۔ اس نے سوچا، چند دنوں کی بات ہے اُس نے ٹیلیفون نمبر بتا دیا تو وہ اُسے دیکھ بھی سکے گا۔ اس کا خیال آتے ہی اس کا دل و دماغ سُن ہو جاتا۔ میری زندگی کا وہ لمحہ کتنا بڑا لمحہ ہوگا۔ جب میں اُس کو دیکھوں گا۔

دوسرے روز جب اُس کا ٹیلی فون آیا تو من موہن نے اس سے کہا۔ "تمہیں دیکھنے کا اشتیاق پیدا ہو گیا ہے۔"

"کیوں؟"

"تم نے کہا تھا کہ آخری دن جب یہاں میری بادشاہت ختم ہونے والی ہوگی تو تم مجھے اپنا نمبر بتا دو گی۔"

"کہا تھا۔"

"اس کا یہ مطلب ہے کہ تم مجھے اپنا ایڈریس دے دو گی۔ میں تمہیں دیکھ سکوں گا۔"

"تم مجھے جب چاہو دیکھ سکتے ہو۔ آج ہی دیکھ لو۔"

"نہیں نہیں۔" پھر کچھ سوچ کر کہا۔ "میں ذرا اچھے لباس میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔ آج ہی ایک دوست سے کہہ رہا ہوں وہ مجھے سوٹ سلوا دے گا۔"

وہ ہنس پڑی۔ "بالکل بچے ہو تم۔ سنو جب تم مجھ سے ملو گے تو میں تمہیں ایک تحفہ دوں گی۔"

من موہن نے جذباتی انداز میں کہا۔ "تمہاری ملاقات سے بڑھ کر اور کیا تحفہ ہو سکتا ہے۔"

"میں نے تمہارے لئے ایگزکٹا کیمرہ خرید لیا ہے۔"

"اوہ!"

"اس شرط پر دوں گی کہ پہلے میرا فوٹو اتارو۔"

من موہن مسکرایا۔ "اس شرط کا فیصلہ ملاقات پر کروں گا۔"

تھوڑی دیر اور گفتگو ہوئی۔ اس کے بعد اُدھر سے وہ بولی۔ "میں کل اور پرسوں تمہیں ٹیلیفون نہیں کر سکوں گی۔"

من موہن نے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔ "کیوں؟"

"میں اپنے عزیزوں کے ساتھ کہیں باہر جا رہی ہوں۔ صرف دو دن غیر حاضر

رہوں گی۔ مجھے معاف کر دینا۔"

یہ سننے کے بعد من موہن سارا دن دفتر ہی میں رہا۔ دوسرے دن صبح اٹھا تو اس نے حرارت محسوس کی سوچا کہ یہ اضمحلال شاید اس لئے ہے کہ اس کا ٹیلیفون نہیں آئے گا۔ لیکن دوپہر تک حرارت تیز ہو گئی۔ بدن تپنے لگا آنکھوں سے شرارے پھوٹنے لگے، من موہن میز پر لیٹ گیا۔ پیاس بار بار ستاتی تھی۔ اٹھتا اور نل سے منہ لگا کر پانی پیتا۔ شام کے قریب اسے اپنے سینے پر بوجھ محسوس ہونے لگا دوسرے روز وہ بالکل نڈھال تھا۔ سانس بڑی دقت سے آتا تھا۔ سینے کی دکھن بہت بڑھ گئی تھی۔

کئی بار اس پر ہذیانی کیفیت طاری ہوئی۔ بخار کی شدت میں وہ گھنٹوں ٹیلیفون پر اپنی محبوب آواز کے ساتھ باتیں کرتا رہا۔ شام کو اس کی حالت بہت زیادہ بگڑ گئی۔ دھندلائی ہوئی آنکھوں سے اس نے کلاک کی طرف دیکھا، اس کے کانوں میں عجیب و غریب آوازیں گونج رہی تھیں۔ جیسے ہزار ٹیلیفون بول رہے ہیں۔ سینے میں گھنٹیاں سے بج رہے تھے، چاروں طرف آوازیں ہی آوازیں تھیں، چنانچہ جب ٹیلیفون کی گھنٹی بجی تو اس کے کانوں تک اس کی آواز نہ پہنچی بہت دیر تک گھنٹی بجتی رہی ایک دم من موہن چونکا، اس کے کان اب سن رہے تھے لڑکھڑاتا ہوا اٹھا۔ اور ٹیلیفون تک گیا۔ دیوار کا سہارا لے کر اس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے ریسیور اٹھایا، اور خشک ہونٹوں پر لکڑی جیسی زبان پھیر کر کہا: "ہیلو!"

دوسری طرف سے لڑکی بولی: "ہیلو۔ من موہن۔"

من موہن کی آواز لڑکھڑائی: "ہاں من موہن!"

"ذرا اونچی بولو۔"

من موہن نے کچھ کہنا چاہا مگر وہ اس کے حلق میں ہی خشک ہو گیا۔
آواز آئی "میں اجاڑی آگئی بڑی دیر سے تمہیں رنگ کر رہی ہوں۔
۔ کہاں تھے تم۔؟"
من موہن کا سر گھومنے لگا۔
آواز آئی "کیا ہو گیا ہے تمہیں؟"
من موہن نے بڑی مشکل سے اتنا کہا "میری بادشاہت ختم ہو گئی ہے آج"
اس کے منہ سے خون نکلا اور ایک پتلی لکیر کی صورت میں گردن تک دوڑتا چلا گیا۔
آواز آئی "میرا نمبر نوٹ کر لو۔ فائیو نوٹ تھری ون فور، فائیو نوٹ تھری
ون فور۔ صبح فون کرنا" یہ کہہ کر اس نے ریسیور رکھ دیا۔ من موہن اوندھے
منہ ٹیلیفون پر گرا اس کے منہ سے خون کے بلبلے پھوٹنے لگے۔

۱۴ جون ۱۹۵۰ء

تقی کاتب

ولی محمد جب تقی کو پہلی مرتبہ دفتر میں لایا تو اس نے مجھے قطعاً متاثر نہ کیا۔
لکھنؤ اور دلّی کے جاہل اور خود سر کاتبوں سے میرا جی جلا ہوا تھا۔ ایک تھا
اُس کو جاو بیجا پیش ڈالنے کی بُری عادت تھی۔ مَوت کو مُوت اور سَوت کو سُوت
بنا دیتا تھا۔ میں نے بہت سمجھایا مگر وہ نہ سمجھا۔ اُس کو اپنے اہل زبان ہونے کا
بہت زعم تھا، میں نے جب بھی اُس کو پیش کے معاملے میں ٹوکا اس نے اپنی
ڈاڑھی کو تاؤ دے کر کہا "میں اہل زبان ہوں صاحب۔ اس کے علاوہ تیس
سیپاروں کا حافظ ہوں۔ اعراف کے معاملے میں آپ مجھ سے کچھ نہیں کہہ سکتے"
میں نے اُسے اور کچھ نہ کہا اور رخصت کر دیا۔
اس کی جگہ ایک دلّی کے کاتب نے لی۔ اور سب ٹھیک تھا۔ مگر اس کو

اصلاح کرنے کا خبط تھا، اور اصلاح بھی ایسی کہ میری آنکھوں میں خون اُتر آتا تھا
کوئی مضمون تھا۔ میں نے اس میں یہ لکھا "اس کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ
گئے"۔ اس نے یہ اصلاح فرمائی "اُس کے ہاتھ پاؤں کے طوطے اُڑ گئے"۔
میں نے اس کا مذاق اُڑایا تو وہ خالص دہلوی لب و لہجہ میں بڑبڑاتا
ملازمت سے علیحدہ ہو گیا۔

رام پور کا ایک کاتب تھا۔ بہت ہی خوش خط مگر اس کو اختصار کے
دورے پڑتے تھے، سطریں کی سطریں اور پیرے کے پیرے غائب کرتا تھا
جب اس کو پورا صفحہ دوبارہ لکھنے کو کہتا تو وہ جواب دیتا "اتنی محنت مجھ
سے نہ ہو گی صاحب۔ پوٹ میں لکھ دوں گا"۔

پوٹ میں لکھوانا مجھے سخت ناپسند تھا، چنانچہ یہ رامپوری کاتب
بھی زیادہ دن دفتر میں نہ ٹک سکے۔

ولی محمد ہیڈ کاتب جب تک کہ پہلی مرتبہ دفتر میں لایا تو اس نے مجھے قطعاً
متاثر نہ کیا۔ خط کا نمونہ دیکھا۔ خاص اچھا نہیں تھا۔ دائروں میں پختگی نہیں تھی۔ میں
گنوار لکھائی کا قائل ہوں۔ وہ چھدرا لکھتا تھا۔ کم عمر تھا۔ انداز گفتگو میں عجیب قسم
کی بوکھلاہٹ تھی، بات کرتے وقت اس کا ایک بازو ہلتا تھا جیسے کلاک کا پنڈولم۔
رنگ سفید تھا، بالائی ہونٹ پر کھورے تھے۔ ایسا معلوم
ہوتا تھا کہ اُس نے خود کتابت کی سیاہی سے ہلکی ہلکی مونچھیں بنائی ہیں۔

میں نے اُسے چند روز کے لئے رکھا، مگر اس نے اپنی شرافت، محنت
اور تابعداری سے دفتر میں اپنے لئے ایک مستقل جگہ پیدا کر لی۔ ولی محمد

سے میرے تعلقات بہت بے تکلف تھے، جنسیات کے متعلق اپنی معلومات میں اضافہ کرنے کے لئے وہ اکثر مجھ سے گفتگو کیا کرتا تھا۔ اس دوران میں محمد تقی خاموش رہتا۔ عورت اور مرد کے جنسی تعلق کا ذکر کھلے الفاظ میں آتا تو اس کے کان کی لویں سرخ ہو جاتیں۔ ولی محمد جو کہ شادی شدہ تھا اُسے خالص پنجابی انداز میں چھیڑتا۔

"منٹو صاحب اس کا مردہ خراب ہو رہا ہے اس سے کہیے کہ شادی کر لے۔ جب بھی کوئی فلم دیکھ کر آتا ہے ساری رات کروٹیں بدلتا رہتا ہے۔"

تقی عام طور پر جھینپتے ہوئے کہتا "منٹو صاحب جھوٹ بولتا ہے۔"

ولی محمد کی سیاہ نوکیلی مونچھیں تھرکنے لگتیں "اور یہ جھوٹ ہے منٹو صاحب کہ یہ چالی (بابڑنگ) کی پہودی چھوکریوں کی ننگی ٹانگیں دیکھ کر ان کی نقشہ کشی کیا کرتا ہے۔"

تقی کی ناک کی چونچ پر پسینے کے قطرے نمودار ہو جاتے "میں تو میں ڈرائنگ سیکھ رہا ہوں۔"

ولی محمد کہتے اور چھیڑتا "ڈرائنگ چہرے کی سیکھو۔ یہ کس ڈرائنگ ماسٹر نے تم سے کہا کہ پہلے ننگی ٹانگوں سے شروع کرو۔"

محمد تقی قریب قریب رو دیتا، چنانچہ میں ولی محمد کو منع کرتا کہ وہ اُسے نہ چھیڑا کرے۔ اس پر ولی محمد کہتا "منٹو صاحب میں اس کے والد صاحب سے کہہ چکا ہوں آپ سے بھی کہتا ہوں کہ اس لونڈے کی شادی کرا دیجئے ورنہ اس کا مردہ بالکل خراب ہو جائے گا۔"

محمد تقی کے باپ سے میری ملاقات ہوئی۔ ڈاڑھی والے بزرگ تھے، نماز روزے کے پابند، ماتھے پر محراب، بھنڈی بازار میں، ولی محمد کی شراکت میں گھی کی ایک چھوٹی سی دوکان کرتے تھے، محمد تقی سے ان کو بہت محبت تھی، باتیں کرتے ہوئے آپ نے مجھ سے کہا "تقی دو برس کا تھا کہ اُس کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔ خدا اُس کو غریق رحمت کرے، بہت ہی نیک بی بی تھی، منٹو صاحب یقین جانئے اس کی موت کے بعد عزیزوں اور دوستوں نے بہت زور دیا کہ میں دوسری شادی کر لوں، مگر مجھے تقی کا خیال تھا۔ میں نے سوچا ہو سکتا ہے کہ میں اس کی طرف سے غافل ہو جاؤں۔ چنانچہ دوسری شادی کے خیال کو میں نے اپنے قریب تک نہ آنے دیا اور اس کی پرورش خود اپنے ہاتھوں سے کی۔ اللہ کا بڑا فضل و کرم ہے کہ اُس نے مجھ گنہگار کو سرخرو کیا۔ خدا اس کو زندگی اور نیکی کی ہدایت دے۔!"

محمد تقی اپنے باپ کے اس ایثار کی ہمیشہ تعریف کیا کرتا۔ "بہت کم باپ اتنی بڑی قربانی کر سکتے ہیں، ابا جوان تھے، اچھا کماتے تھے، چاہتے تو چٹکیوں میں ان کو اچھی سے اچھی بیوی مل جاتی، لیکن میری خاطر انہوں نے تجرد کی زندگی بسر کی۔ اتنی محبت اور اتنے پیار سے میری پرورش کی کہ مجھے ماں کی کمی محسوس ہی نہ ہونے دی۔"

ولی محمد بھی تقی کے باپ کا معترف تھا۔ مگر اُسے صرف یہ شکایت تھی کہ مولانا ذرا سنکی ہیں۔ "منٹو صاحب آدمی بہت اچھا ہے، کاروبار میں سولہ آنے کھرا ہے۔ تقی سے بہت پیار کرتا ہے... لیکن یہ پیار... میں اب اپنے احساسات کن الفاظ میں پیش کروں۔ اس کا پیار حد سے بڑھا ہوا ہے... یعنی وہ اس طرح

پیار کرتا ہے، جس طرح کوئی حاسد، عاشق اپنے معشوق سے کرتا ہے۔"

"میں نے ولی محمد سے پوچھا: "تمہارا مطلب؟"

ولی محمد نے اپنی مونچھوں کی نوکیں درست کیں: "مطلب، وہ ---
مطلب میں نہیں سمجھا سکتا آپ خود سمجھ لیجئے۔"

میں نے مسکرا کر کہا: "بھائی تم ذرا وضاحت سے کام لو تو میں سمجھ جاؤں گا۔"

ولی محمد نے سُرخیاں لکھنے والے قلم کو کپڑے کے چیتھڑے سے صاف کرتے ہوئے کہا: "مولانا سنکی ہیں۔ مجھے معلوم نہیں کیوں۔ تقی کہتا ہے کہ پہلے ان کے پیار اور ان کی شفقت کا یہ رنگ نہیں تھا، جو اب ہے۔ یعنی پچھلے چند برسوں سے آپ نے اپنے فرزند ارجمند سے پوچھ گچھ کا لامتناہی سلسلہ شروع کر رکھا ہے۔ لامتناہی ٹھیک استعمال ہوا ہے نہ منٹو صاحب؟"

"ٹھیک استعمال ہوا ہے۔ ہاں یہ پوچھ گچھ کا سلسلہ کیا ہے؟"

"یہی تم رات کو دیر سے کیوں آئے؟ سفید گلی میں کیا کرنے گئے تھے۔ وہ بہو دن تم سے کیا بات کر رہی تھی۔؟ اتنے فلم کیوں دیکھتے ہو۔ پچھلے ہفتے تم نے کتابت کی اُجرت میں سے چار آنے کہاں رکھے؟۔ ولی محمد سے تم بائی کلہ کے پل پر بیٹھے کیا باتیں کر رہے تھے؟۔ کیا وہ تمہیں ورغلا تو نہیں رہا تھا کہ شادی کر لو۔"

میں نے ولی محمد سے پوچھا: "ورغلانا کیا ہوا؟"

"معلوم نہیں۔ لیکن مولانا سمجھتے ہیں کہ تقی کا ہر دوست اسے شادی کے لئے ورغلاتا ہے۔ میں اس کو ورغلاتا تو نہیں لیکن یہ ضرور کہتا ہوں اور اکثر کہتا ہوں

کہ جان من شادی کر لو، ورنہ تمہارا مردہ خراب ہو جائے گا۔ اور منٹو صاحب میں آپ کو خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ لڑکے کو ایک بیوی کی اشد ضرورت ہے۔"

چار پانچ برس گزر چکے تھے۔ محمد تقی کی مونچھوں کے بھورے بال اب بھورے نہیں تھے۔ ہر روز ڈاڑھی مونڈتا تھا، ٹیڑھی مانگ بھی نکالتا تھا، اور دفتر میں جب جنسیات کے متعلق گفتگو چھڑتی تو وہ قلم دانتوں میں دبا کر غور سے سنتا۔ عورت اور مرد کے جنسی تعلق کا ذکر کھلے الفاظ میں ہوتا تو اس کے کانوں کی لویں سرخ نہ ہوتیں۔ محمد تقی کو بیوی کی ضرورت ہو سکتی تھی۔

ایک دن جب کہ اور کوئی دفتر میں نہیں تھا اور اکیلا تقی تخت پر دیوار کے ساتھ پیٹھ لگائے پرچے کی آخری کاپی مکمل کر رہا تھا، میں نے اس کے خد و خال کا غور سے معائنہ کرتے ہوئے پوچھا: "تقی تم شادی کیوں نہیں کرتے؟"

سوال اچانک کیا گیا تھا۔ تقی چونک پڑا: "جی؟"

"میرا خیال ہے تم شادی کر لو۔"

تقی نے قلم کان میں اڑسا اور کسی قدر شرما کر کہا: "میں نے ابا سے بات کی ہے۔"

"کیا کہا انہوں نے؟"

تقی تفصیل سے کچھ کہنا چاہتا تھا مگر نہ کہہ سکا: "جی وہ — کچھ نہیں — وہ کہتے ہیں ابھی اتنی جلدی کیا ہے؟"

"تمہارا کیا خیال ہے؟"

"جو اُن کا ہے۔"

اس جواب کے بعد گفتگو کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ تقی نے پرچے کی آخری کاپی

مکمل کی اور اُسے جوڑ کر چلا گیا۔

چند دن کے بعد ولی محمد نے تقی کی موجودگی میں مجھ سے کہا "منٹو صاحب برا نظر آ رہا ہے۔ مولانا اور تقی میں دھیں پڑا اس ہوتے ہوتے رہ گئی۔"

ولی محمد یوں تو اردو بولتا تھا، لیکن پنجابی اور بمبئی کی اُردو کے کئی الفاظ جزا پیدا کرنے کے لئے استعمال کرنے کا عادی تھا۔

تقی نے اس کی بات سنی اور خاموش رہا۔

ولی محمد نے اپنی تھرکتی ہوئی نوکیلی مونچھوں کو آنکھوں کا زاویہ بدل کر دیکھا۔ پھر اس زاویے کو بدل کر اس نے تقی کی طرف دیکھا، اور مجھ سے کہا "لڑکے کو ایک عدد بیوی کی اشد ضرورت ہے، لیکن باپ اس ضرورت کو مانتا ہی نہیں۔ اس نے بہت سمجھایا منٹو صاحب، مگر مولانا نے ایک نہ سُنی۔ منٹو صاحب یہ کیا محاورہ ہے ایک نہ سنی۔ مولانا نے سُنی تو ہزار تھیں، لیکن سُنی اَن سنی کر دیں۔ یہ محاورے بھی خوب چیز ہیں۔ اور مولانا بھی۔۔ اپنے وقت کے ایک لاجواب محاورے ہیں۔"

تقی بھنا کر مجھ سے مخاطب ہوا "منٹو صاحب اس سے کہئے خاموش رہے۔"

ولی محمد بولا "منٹو صاحب اس سے کہئے کہ مولانا کے سامنے خاموش رہا کرے۔"

"وہ شادی کی اجازت نہیں دیتے، ٹھیک ہے، باپ ہیں، وہ اس کا نفع یا نقصان سوچ سکتے ہیں۔" میں نے ولی محمد سے کہا۔

باپ بیٹے کی چخ ضرور ہوئی تھی۔ تقی نے مولانا سے درخواست کی تھی کہ وہ اس کی شادی کسی اچھے گھرانے میں کر دیں یہ سُن کر وہ چڑ گئے اور تقی کے دوستوں پر برسنے لگے "تمہارے دوستوں نے تمہاری جڑوں میں پانی پھیر دیا۔ جب میں تمہاری عمر کا

تھا۔ مجھے معلوم ہی نہیں تھا کہ شادی بیاہ کس جانور کا نام ہے؟"

یہ سُن کر تقی نے ڈرتے ڈرتے کہا "لیکن... آپ کی شادی تو چودہ برس کی عمر میں ہوئی تھی۔"

مولانا نے اُسے ڈانٹا "تمہیں کیا معلوم ہے؟"

تقی خاموش ہو گیا۔ وہ بہت ہی کم گو اور فرمانبردار قسم کا لڑکا تھا۔ دو چار مرتبہ اُس نے بے تکلف گفتگو کی اور اس کے کھلنے کا موقع دیا تو مجھے معلوم ہوا کہ اس کو بیوی کی واقعتاً ضرورت ہے۔ اس نے مجھ سے ایک روز جھینپتے ہوئے کہا "میرے خیالات آج کل بہت پراگندہ رہتے ہیں۔ ولی محمد شادی شدہ ہے وہ جب اپنی بیوی کے ساتھ باہر جاتا ہے تو میرے دل کو جانے کیا ہوتا ہے آپ نے ایک دفعہ احساس کمتری کے متعلق باتیں کی تھیں۔ مجھے احساس ہوتا ہے کہ میں عنقریب اس کا شکار ہونے والا ہوں مگر کیا کروں ابا مانتے ہی نہیں، میں شادی کی بات کرتا ہوں تو وہ چڑ جاتے ہیں... جیسے... جیسے شادی کرنا کوئی گناہ ہے... وہ اپنی مثال دیتے ہیں کہ دیکھو تمہاری ماں کے مرنے کے بعد اب تک میں نے شادی نہیں کی۔ لیکن منٹو صاحب۔ اس مثال کا میرے ساتھ کیا تعلق ہے۔ اُنہوں نے شادی کی اللہ کو یہ منظور نہیں تھا کہ ان کی بیوی زندہ رہتی انہوں نے بہت بڑی قربانی کی جو میری خاطر دوسری شادی نہ کی۔ لیکن وہ چاہتے ہیں کہ میں کنوارا ہی رہوں۔"

"میں نے پوچھا کیوں؟"

تقی نے جواب دیا "معلوم نہیں منٹو صاحب۔ وہ میری شادی کے بارے

میں کچھ سُننے کے لیئے تیار نہیں۔ میں ان کی بڑی عزت کرتا ہوں۔ لیکن کل باتوں باتوں میں جذبات سے مغلوب ہو کر میں گستاخی کر بیٹھا۔"

"کیا؟"

تقی نے انتہائی ندامت کے ساتھ کہا "میں منت سماجت کرتے کرتے اور سمجھاتے سمجھاتے تنگ آ گیا تھا۔ کل جب انہوں نے مجھ سے کہا کہ وہ میری شادی کے متعلق کچھ سُننے کو تیار نہیں تو میں نے غصے میں آ کر ان سے یہ کہہ دیا۔ آپ نہیں سُنیں گے تو میں اپنی شادی کا بندوبست خود کر لوں گا۔"

میں نے اس سے پُوچھا "یہ سُن کر انہوں نے کیا کہا؟"

"ابھی ابھی گھر سے نکل جاؤ۔ چنانچہ کل رات میں یہاں دفتر ہی میں سویا۔"

میں نے شام کو ولی محمد کے ذریعہ سے مولانا کو بُلوایا۔ چند مبارکباد باتیں ہوئیں۔ تو انہوں نے تقی کو گلے لگا کر رونا شروع کر دیا پھر شکوے ہونے لگے۔

"مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہ لڑکا جس کی خاطر میں نے تجرد برداشت کیا ایک روز میرے ساتھ ایسی گستاخی کے ساتھ پیش آئے گا۔ میں نے ماؤں کی طرح اسے پالا پوسا آپ سُوکھی کھائی پر اس کے لیئے خود اپنے ہاتھوں گھی میں گوندھ گوندھ پراٹھے پکائے۔"

میں نے بات کاٹ کر کہا "مولانا، یہ سب آپ کے ان احسانات کو نہیں مانتا آپ کی تمام قربانیاں اس کے دل و دماغ پر نقش ہیں۔ آپ نے اتنا کچھ کیا، کیا آپ اس کی شادی نہیں کر سکتے؟ ماں باپ کی تو سب سے بڑی خواہش یہ ہوتی ہے۔ کہ وہ اپنی اولاد کو پھلتا پھولتا دیکھیں آپ کے گھر میں بہو آئے گی، بال بچے ہوں گے، دادا جان بن کر آپ کو پُر فخر مسرت نہ ہو گی؟ میرا خیال ہے تقی کو غلط فہمی

ہوئی ہے کہ آپ شادی کے خلاف ہیں۔"

مولانا لاجواب ہو گئے۔ رومال سے اپنی آنکھیں خشک کرنے لگے۔ تھوڑے توقف کے بعد بولے "پر کوئی ایسا رشتہ تو ہو۔۔۔"

"آپ ہاں کر دیجئے سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

ولی محمد نے یہ کچھ ایسے انداز میں کہا "چلئے انگوٹھا لگائیے۔" مولانا بدک گئے۔ "لیکن ایسی جلدی بھی کیا ہے؟"

اس پر میں نے بزرگوں کا انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔ "کارِ خیر میں دیر نہیں ہونی چاہیئے۔ آپ اوروں کو چھوڑیئے، خود اپنی پسند کا رشتہ ڈھونڈھیئے۔ ماشاء اللہ ڈونگری میں سب لوگ آپ کو جانتے ہیں۔ یہاں بمبئی میں پسند نہ ہو تو اپنے پنجاب میں سہی۔ کون سا کالے کوسوں دور ہے۔"

مولانا نے سر ہلا کر صرف اتنا کہا "جی ہاں۔"

میں نے تقی کے کاندھے پر ہاتھ رکھا "لو بھئی تقی فیصلہ ہو گیا۔ مولانا کو تم ضدی بچوں کی طرح اب تنگ نہ کرنا۔ میں خود اس معاملے میں ان کی مدد کروں گا۔" یہ کہہ کر میں مولانا سے مخاطب ہوا "یہاں کچھ خاندان ہیں۔ ان سے میری کچھ جان پہچان ہے۔ میں اپنی بیوی سے کہوں گا۔ وہ لڑکیاں دیکھ لے گی۔"

تقی نے ہولے سے کہا "آپ کی بہت مہربانی۔"

کئی مہینے گزر گئے مگر تقی کی شادی کی بات چیت کہیں بھی شروع نہ ہوئی۔ ولی محمد اس دوران میں اُسے برابر اکساتا رہا۔ وہ اپنے باپ کے پیچھے پڑا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک روز مولانا میرے پاس آئے اور کہا "سانگلی اسٹریٹ کی تیسری گلی میں نکڑ کی بلڈنگ میں شاید

آپ جانتے ہی ہوں۔ یوپی کا ایک خاندان رہتا ہے۔۔۔"

میں نے فوراً کہا۔ "آپ کہیئے۔ میں جانتا ہوں!"

مولانا نے پوچھا۔ "کیسے لوگ ہیں؟"

"بے حد شریف۔"

"جو سب سے بڑا بھائی ہے، اس کی بڑی لڑکی میں نے سنا ہے خاصی اچھی ہے؟"

"میں پیغام بھجوا دیتا ہوں۔"

مولانا گھبرا گئے۔ "نہیں نہیں۔ اتنی جلدی نہیں۔ یہ بھی تو دیکھنا ہے کہ لڑکی شکل و صورت کی کیسی ہے؟"

"میں اپنی بیوی کے ذریعے معلوم کر لوں گا۔"

میری بیوی نے اس لڑکی کو دیکھا تو پسند کیا۔ قبول صورت تھی، تعلیم انٹرنس تک تھی، طبیعت کی بہت ہی اچھی تھی۔ یہ سب خوبیاں مولانا سے بیان کر دی گئیں، وہ لڑکی کے باپ سے ملے۔ جہیز اور حق مہر کے متعلق بات چیت کی۔ یہ ابتدائی مراحل بخیر و خوبی طے ہو گئے۔ تقی بہت خوش تھا لیکن تین مہینے گزر گئے وہ بات وہیں کی وہیں رہی۔ آخر ایک روز معلوم ہوا کہ لڑکی والوں نے مزید گفتگو سے انکار کر دیا ہے کیونکہ وہ تقی کے باپ کی میں میخ سے تنگ آ چکے ہیں، بار بار وہ ان سے جا جا کر یہ کہتا تھا۔ دیکھئے لڑکی کے جہیز میں اتنے جوڑے ہوں برتنوں کی تعداد یہ ہو، لڑکی نے اگر میری عدول حکمی کی تو اس کی سزا طلاق ہو گی۔ فلم دیکھنے ہرگز نہ جائے گی۔ پردے میں رہے گی۔

میں نے جب ان بیجا باتوں کا ذکر تقی سے کیا تو وہ اپنے باپ کی طرف ہو گیا۔

"نہیں منٹو صاحب لڑکی والے ٹھیک نہیں۔ ابا کا یہ کہنا ٹھیک ہے کہ وہ مجھے زن مرید بنانا چاہتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "ایسا ہے تو چھوڑو۔ کسی اور جگہ سہی"

تقی نے کہا۔ "ابا کوشش کر رہے ہیں"

مولانا نے ڈونگری میں اپنے ایک واقف کار کے ذریعے سے بات چیت شروع کی۔ سب کچھ طے ہو گیا۔ نکاح کی تاریخ بھی مقرر ہو گئی مگر ایک دم کچھ ہوا اور سب کچھ ڈھے گیا۔ لڑکی والوں کو تقی پسند تھا لیکن جب مولانا سے اچھی طرح ملنے جلنے کا اتفاق ہوا تو وہ پیچھے ہٹ گئے اور لڑکی کا رشتہ کسی اور جگہ پکا کر دیا۔ تقی نے پھر اپنے باپ کی طرف داری کی اور مجھ سے کہا۔ "یہ لوگ بڑے لالچی تھے منٹو صاحب! ایک دولتمند کا لڑکا مل گیا تو اپنی بات سے پھر گئے۔ ابا شروع ہی سے کہتے تھے کہ یہ لوگ مجھے ایماندار معلوم نہیں ہوتے لیکن میں خواہ مخواہ ان کے پیچھے پڑا رہا کہ جلدی معاملہ طے کیجئے۔"

کچھ عرصے کے بعد تیسری جگہ کوشش شروع ہوئی یہاں بھی نتیجہ صفر۔ چوتھی جگہ بات چیت شروع ہوئی تو تقی نے مجھ سے کہا منٹو صاحب وہ لوگ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔"

"بڑے شوق سے ملیں۔"

میں اُن سے ملا آدمی شریف تھے مولانا سے ان کی چند مختصر باتیں ہوئیں میں نے تقی کی تعریف کی، معاملہ طے ہو گیا لیکن چند ہی دنوں میں گڑبڑ پیدا ہو گئی، لڑکی کے بڑے بھائی نے کسی سے سُنا کہ مولانا دوکان پر اپنے ایک دوست سے کہہ رہے تھے۔ "لڑکی میرے کہنے پر نہ چلی، تو میں تقی کی دوسری شادی کر دوں گا۔" وہ یہ سُن کر میرے پاس آیا۔ میں نے مولانا کو بلوایا، ان سے پوچھا تو داڑھی پر ہاتھ پھیر کر کہنے لگے" میں نے

کیا بُرا کہا۔ میں ایسی بہو گھر میں نہیں لانا چاہتا جو میرا کہا نہ مانے ۔ میں تقی کی شادی اس لئے کر رہا ہوں کہ مجھے آرام پہنچے۔"

عجیب و غریب منطق تھی، میں نے پوچھا۔" آپ کو آرام ضرور پہنچنا چاہئے مگر آپ کی یہ منطق میری سمجھ میں نہیں آئی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خاوند اور بیوی کا رشتہ آپ کی سمجھ سے بالاتر ہے۔"

مولانا نے کسی قدر خفگی کے ساتھ کہا۔" میں خاوند رہ چکا ہوں منٹو صاحب۔ آپ کے خیالات میرے خیالات سے بہت مختلف ہیں۔ آپ کے ساتھ کام کر کے مجھے افسوس ہے میرے لڑکے کے خیالات بھی بدل گئے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ تقی سے مخاطب ہوئے۔" سُنا تم نے۔ میں ایسی لڑکی گھر میں لانا چاہتا ہوں جو میری تمہاری خدمت کرے۔"

اس کے بعد دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ ان سے جو میں نے نتیجہ نکالا وہ میں نے تقی کو بتلا دیا۔" دیکھو بھئی۔ بات یہ ہے کہ تمہارے والد صاحب تمہاری شادی نہیں کرنا چاہتے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہر بار کوئی نہ کوئی شوشہ چھیڑ دیتے ہیں۔ کوئی نہ کوئی بہانہ ڈھونڈ نکالتے ہیں۔ تاکہ معاملہ آگے نہ بڑھنے پائے۔"

مولانا خاموش اپنی ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرتے رہے۔ تقی نے مجھ سے پوچھا۔" کیوں۔ یہ میری شادی کیوں نہیں کرنا چاہتے۔"

میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔" مولانا کا دماغ خراب ہے۔"

مولانا کو اس قدر طیش آیا کہ منہ میں جھاگ بھر کر واہی تباہی بکنے لگے۔ میں نے تقی سے کہا۔" جاؤ، مولانا کو کسی ذہنی شفاخانے میں لے جاؤ۔ اور میری یہ بات یاد رکھو۔ جب تک ان کا دماغ درست نہیں ہوگا۔ تمہاری شادی ہرگز ہرگز نہیں

کر دیں گے۔ ان کی دماغ کی خرابی کا باعث وہ قربانی ہے جو انہوں نے تمہارے لئے کی۔"

مولانا نے تقی کا بازو زور سے پکڑا اور مجھے مسلوائیں سناتے چلے گئے۔ ولی محمد میرے پاس بیٹھا خاموشی سے سن رہا تھا۔ اتنی دیر وہ اپنی نوکیلی مونچھوں کے بیچ سے بالکل غافل رہا۔ جب مولانا اور تقی چلے گئے تو اس نے آنکھوں کا زاویہ درست کر کے ان کی طرف دیکھا اور کہا "مردہ خراب ہو رہا ہے بیچارے کا لیکن منٹو صاحب آپ نے اوس تولہ اور پاؤ رتی کی بات کہی۔ محاورہ درست استعمال ہوا ہے نہ؟"

"تم نے محاورہ درست استعمال کیا ہے، لیکن افسوس ہے کہ مولانا کی طبیعت صاف کرتے ہوئے میں نے مناسب اور موزوں الفاظ استعمال نہ کئے۔"

"بڑا صاعون آدمی ہے جی!" ولی محمد نے یہ کہہ کر اپنی مونچھ کا ہٹیلا بال بڑے زور سے اکھیڑا اور بڑی سنجیدگی اختیار کر کے مجھ سے پوچھا "منٹو صاحب کیا مطلب تھا آپ کا اس سے کہ مولانا کے دماغ کی خرابی کا باعث وہ قربانی ہے جو اس نے تقی کے لئے کی۔ بات ضرور باون تولے اور پاؤ رتی کی ہے۔ لیکن پوری کی طرح میرے ذہن میں بیٹھی نہیں۔"

میں نے اس کو سمجھایا "بیوی کی موت کے بعد ایک وقتی جذبہ تھا جس کے تحت مولانا نے تجرد کے دن گزارنے کا تہیہ کیا، یہ جذبہ اپنی طبعی موت مرا تو آپ کے لئے دو سوگ ہو گئے۔ ایک بیوی کی موت کا دوسرا جذبے کی موت کا۔ وقت گزرتا گیا اور مولانا نیم کے کریلے بنتے گئے۔ مجھے تو کبھی ولی محمد پر بہت ترس آتا ہے غریب پر۔ ایک شخص جس نے پچیس برس تک اپنے اور عورت کے درمیان ایک دیوار حائل رکھی ہو۔ وہ کس طرح اپنے جوان بیٹے کے پہلو میں ایک جوان عورت

دیکھ سکتا ہے اور وہ بھی نظروں کے بہت قریب۔"

دوسرے دن تقی نہ آیا۔ ولی محمد کے ہاتھ اس نے کتابت کا بل بھجوا دیا جو ادا کر دیا گیا۔ تقی کو بہت افسوس تھا کہ میں نے اس کے باپ کو برا بھلا کہا۔ میں نے ولی محمد سے کہہ دیا۔ مجھے کوئی افسوس نہیں۔ تقی کو معلوم ہونا چاہیئے تھا کہ اس کا باپ ذہنی اور روحانی طور پر بیمار ہے لیکن مجھے یہ افسوس ضرور ہے کہ اس نے کام چھوڑ دیا۔"

ولی محمد نے تقی سے واپس آنے کو کہا مگر وہ نہ مانا۔ اس نے کسی اور دفتر میں ملازمت نہ کی اور دوکان پر بیٹھ کر کبھی بیچنے لگا۔ ولی محمد نے جب زور دیا تو اس نے وہیں کتابت کا کام بھی شروع کر دیا۔

میں ایک کام سے دہلی چلا گیا۔ تین چار مہینے وہاں رہ کر کبھی لوٹا تو ولی محمد نے پلیٹ فارم ہی پر یہ خبر سنائی کہ تقی کی شادی ایک ہفتہ پہلے بخیر و خوبی ہو چکی ہے مجھے یقین نہ آیا۔ لیکن ولی محمد نے قرآن کی قسم کھا کر کہا۔ "منٹو صاحب میں جھوٹ نہیں کہتا۔ نکاح کے چھوارے میں نے سنبھال کر رکھے ہوئے ہیں۔ جس کی شادی نہ ہوئی ہو اس کے لیے اکسیر ثابت ہوں گے۔"

میں نے تقی کو بلایا مگر وہ نہ آیا۔

تقریباً ڈیڑھ مہینے کے بعد ایک دن علی الصبح ولی محمد آیا اس کی نوکیلی مونچھیں تھرک رہی تھیں کہنے لگا۔ "منٹو صاحب، کل رحمین پٹاس ہو گئی باپ بیٹے میں تقی اپنی بیوی کو لے کر چلا گیا کہیں۔"

"کہاں؟"

"معلوم نہیں۔" یہ کہہ کر آنکھوں کا زاویہ بدل کر ولی محمد نے اپنی نوکیلی مونچھوں

کو دیکھیے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا منٹو صاحب۔ لڑائی کا باعث معلوم نہیں ہو سکا۔ ــ مولانا بالکل خاموش ہیں ــ"

مولانا بہت دیر تک خاموش رہے اور اُن کا بیٹا محمد تقی بھی ــــــــ بمبئی میں ولی محمد اور اس کے ساتھیوں نے تقی کو بہت تلاش کیا مگر اس کا کوئی سُراغ نہ ملا۔

بہت دنوں بعد ولی محمد سے مجھے تقی کا ایک خط وصول ہوا لکھا تھا "بہت دنوں سے سوچ رہا تھا کہ آپ کو خط لکھوں اور حالات سے آگاہ کروں مگر جُرأت ساتھ نہ دیتی تھی۔ میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ یہ خط کسی اور کو نہ دکھائیے گا۔

آپ نے میرے والد کے متعلق جو کچھ کہا تھا ٹھیک نکلا۔ میں نے آپ کی باتوں کا بُرا مانا تھا۔ اس لئے کہ مجھے اصلیت کا علم نہیں تھا جو مجھے شادی کے بعد معلوم ہوئی میرے والد کا دماغ واقعی درست نہیں ہو سکتا ہے پہلے ٹھیک ہو، لیکن میری شادی کے بعد تو قطعاً ان کی دماغی حالت درست نہ تھی۔ ان کی یہی کوشش تھی کہ میں اپنی بیوی سے دور رہوں مجھ میں اور اس میں دوری پیدا کرنے کے لئے وہ عجیب و غریب طریقے ایجاد کرتے تھے جو ایک دیوانہ ہی کر سکتا ہے۔ میں نے بہت دیر تک برداشت کیا۔ مجھے تمام واقعات بیان کرتے ہوئے بہت شرم محسوس ہوتی ہے۔ ایک روز میری بیوی غسلخانے میں نہا رہی تھی۔ آپ نے دروازے میں سے جھانک کر دیکھنا شروع کر دیا۔۔ میں اور کیا لکھوں۔ سمجھ میں نہیں آتا۔ اُن کے دماغ کو کیا ہو گیا ہے، خدا ان کی حالت پر رحم کرے۔

میں یہاں دلی میں ہوں اور بہت خوش ہوں۔"

میں یہ خط پڑھ رہا تھا کہ ولی محمد آیا۔ اس کے پاس تقی کا ایک خط تھا۔ میری طرف بڑھا کر اس نے کہا۔ "یہ خط تقی نے دہلی سے اپنے باپ کو لکھا ہے۔ صرف چند الفاظ ہیں۔"

"میں نے پوچھا کیا؟"

ولی محمد نے کہا۔ "پڑھ لیجئے۔"

میں نے یہ الفاظ پڑھے "قبلہ والد صاحب! میں یہاں خیریت سے ہوں۔ آپ نے میرا گھر آباد کیا ہے۔ میری خواہش ہے کہ آپ بھی اپنا گھر آباد کر لیں۔"

ولی محمد نے آنکھوں کا زاویہ بدل کر اپنی نوکیلی مونچھوں کو دیکھا اور کہا۔ "منٹو صاحب۔ لڑکا ہوشیار ہو گیا ہے۔ لیکن مولانا تو اپنی بات پکی کر چکے ہیں۔"

"کہاں؟"

ولی محمد کی مونچھیں تھرکیں۔ "ایک گھی بیچنے والی سے۔ پانچوں گھی میں اور سر کڑاہے میں۔ محاورہ ٹھیک استعمال کیا ہے نہ منٹو صاحب!"

میں ہنس پڑا۔

یکم جون ۱۹۵۰ء

والد صاحب

توفیق جب شام کو کلب میں آیا تو پریشان سا تھا۔
دو ربر ہارنے کے بعد اس نے جمیل سے کہا "لو بھئی میں چلا"
جمیل نے توفیق کے کورے چٹے چہرے کی طرف غور سے دیکھا۔ اور کہا۔
"اتنی جلدی؟"
ریاض نے تاش کی گڈی کے دو حصے کر کے انہیں بڑے ماہرانہ انداز
میں پھینٹنا شروع کیا۔ اس کی نگاہیں تاش کے پھڑپھڑاتے پتوں پر تھیں۔
لیکن وہ بے سخن توفیق کی طرف تھیں "توفیق آج تم پریشان ہو خلاف
معمول اوپر تلے دو ربر ہارے ہو۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آج شام کو اسپتال
میں نرس مارگریٹ نے تمہارے رومانس کو پوٹاسیم برومائیڈ پلا دیا"

جمیل نے ایک بار پھر غور سے توفیق کے چہرے کی طرف دیکھا۔ "کیوں توفی آج کچھ پچر پچر کیسا رہا؟"

نصیر اپنی کرسی پر سے اٹھا۔ توفیق کی انگلیوں میں پھنسا ہوا سگریٹ نکالا اور زور کا کش لے کر کہنے لگا۔ "سب بکواس ہے۔ توفی نے آج تک جتنے رومانس لڑائے ہیں سب بکواس تھے۔ یہ نرس مارگریٹ کا قصہ تو بالکل من گھڑت ہے۔ مری کی ٹھنڈی ہواؤں سے یہاں لاہور کی گرمیوں میں آنے کے باعث اسے سرسام ہو گیا ہے۔"

توفیق اٹھ کھڑا ہوا۔ "بکو نہیں؟"

نصیر ہنسا۔ "اگر نہیں ہوا تو آج کل میں ہو جائے گا۔ بتاؤ تمہارے ابا کب تک ہسپتال میں رہیں گے؟" یہ کہہ کر وہ توفیق کی کرسی پر بیٹھ گیا۔

توفیق نے اپنے کلف لگے ململ کے کرتے کی ڈھیلی آستینوں کو اوپر چڑھایا اور جمیل کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "چلو چلیں۔ میری طبیعت یہاں گھبرا رہی ہے۔"

جمیل اٹھا۔ "بھئی توفی تم کوئی بات چھپا رہے ہو۔ ضرور کوئی گڑبڑ ہوئی ہے۔"

"گڑبڑ کچھ نہیں۔ نصیر کی بکواس سے کون ہے جس کی طبیعت نہیں گھبراتی۔" توفیق نے جیب سے باجا نکالا اور منہ کے ساتھ لگا کر بجانا شروع کر دیا۔

نصیر نے اپنی ٹانگیں میز پر پھیلا دیں۔ اور زور سے کہا۔ "بکواس ہے۔ سب بکواس ہے۔ یہ دھن جو تم بجا رہے ہو رشید عطرے کی ہے۔ اور رشید

عطرے کی کوئی دھن سن کر آج تک کوئی انگلو انڈین یا کرسچین نہیں بیہوش نہیں ہوئی ۔ بہتر ہوگا اگر تم رومال پر تھوڑا سا کلوروفارم چھڑک کر لے جاؤ ۔"

ریاض نے تاش کی گڈی رکھ دی اور نصیر کی ٹانگیں ایک طرف ریل دیں۔ "کچھ بھی ہو لیکن ہم اتنا جانتے ہیں کہ تو فی یہاں اپنی گاڑی کا ہارن بجائے تو لڑکیاں سن کر اس پر فریفتہ ہو جاتی ہیں ۔"

نصیر نے سگریٹ کی گردن ایش ٹرے میں دبائی "اور سائیکل کی گھنٹی بجائے تو آسمان سے فرشتے اترنے شروع ہو جاتے ہیں۔ ایک دفعہ اس کی کھانسی کی آواز سن کر باغ جناح کی ساری بلبلیں اپنی نغمہ سرائی بھول گئی تھیں۔ بڑا ہنگامہ ہو گیا تھا۔ ماسٹر غلام حیدر نے پورا ایک مہینہ ان کو ریہرسل کرائی، تب جا کر وہ کہیں لوٹاں کرنے لگیں ۔"

توفیق کے سوا باقی سب ہنسنے لگے۔ نصیر ذرا سنجیدہ ہو گیا اٹھ کر توفیق کے پاس آ گیا، اس کے کلف لگے ململ کے کرتے کی ایک شکن درست کی اور کہا "مذاق برطرف ۔ لو اب بتاؤ ہسپتال کی لونڈیا سے تمہارا معاملہ کہاں تک پہنچا۔ میں تو سمجھتا ہوں وہیں کا وہیں ہو گا۔ ایک شریف آدمی اپنڈے سائٹس کا اپریشن کرانے پڑا ہے۔ مقررہ اوقات پر یہ تمہاری نرس صاحبہ تشریف لاتی ہیں۔ جناب صرف ایک دفعہ صبح اور ایک دفعہ شام وہاں جا سکتے ہیں۔ مریض اور وہ بھی قبلہ والد صاحب۔ وہ مریضِ اپنڈے سائٹس اور تم مریضِ عشق ۔"

ریاض نے قریب قریب گا کر کہا "مریضِ عشق پر رحمت خدا کی ۔"

نصیر کی رگِ مذاق پھڑک اُٹھی "اور مریضِ عشق پر جب خدا کی رحمت نازل ہوتی ہے تو بینڈ ماسٹر بن جاتا ہے۔ آج توفیق کا منہ باجا بجا رہا ہے، خدا کی رحمت شاملِ حال رہی تو کل سیکسوفون بجائے گا۔ آہستہ آہستہ اس کے ساتھ دوسرے مریضانِ عشق شامل ہو جائیں گے۔ پھر یہ برساتوں کے ساتھ منہ میں کلارنٹ دبائے فلمی ٹیونیں بجایا کرے گا۔ ہیرا منڈی سے گذرتے ہوئے اس کی کلارنٹ کا منہ اونچا ہو جایا کرے گا۔ گال دھونکنی کی طرح پھولیں گے۔ گلے کی رگیں اُبھر آئیں گی، اور لونڈیاں کوٹھوں پر سے اس پر رحمت خدا وندی کے پھول برسائیں گی۔"

توفیق تنگ آگیا ہاتھ جوڑ کر نصیر سے کہنے لگا "خدا کے لئے یہ بھانڈ پنا بند کرو۔"

نصیر نے جمیل کی طرف دیکھا "لو صاحب ہم بھانڈ ہو گئے۔ دُنیا بھر کی نقلیں یہ اتاریں۔ زمانے بھر کی خرافات یہ بکیں۔ اور بھانڈ ہم کہلائیں۔ یہ تو آج انہیں منہ میں گھنگنیاں ڈالے دیکھ کر میں نے چھیڑ خانی شروع کر دی کہ شاید اسی حیلے اگلیں۔ منہ سے بولیں، سر سے کھیلیں۔ ورنہ جائے استاد خالی است، کجا رام رام کجا ٹیں ٹیں۔" یہ کہہ کر اس نے توفیق کے کلف لگے ململ کے کرتے کی شکن درست کی "بھئی توفیق ذرا چہکو۔ کیا ہو گیا ہے تمہیں۔"

توفیق نے جیب سے سگریٹ کیس نکالا۔ ایک سُلگایا اور کش لیتا کرسی پر بیٹھ گیا۔ میز پر سے تاش کی گڈی اٹھائی اور پتے کھیلنے لگا۔ لیکن نصیر نے لپک کر پتے اٹھا لئے "یہ بڈھے جرنیلوں کا کھیل ہے جو زندگی میں کئی بار اپنی تمام کشتیاں جلا چکے ہوں۔ تم اتنے مایوس کیوں ہو گئے ہو۔ مارگریٹ

نہ سہی کوئی اور سہی۔" یہ کہہ کر وہ جمیل اور ریاض سے مخاطب ہوا "یار وہ بنا ہوا یہ فتالہ کون ہے؟ خوبصورت ہے؟ چندے آفتاب چندے ماہتاب ہے؟ پانی پیتی ہے تو گردن میں سے دکھائی دیتا ہے؟"

جمیل توفیق کے پاس بیٹھ گیا "وہ فارسی کا محاورہ کیا ہے.... لیلیٰ بنظرِ مجنوں باید دید۔ مارگریٹ بنظرِ توفی باید دید۔ کیوں توفی؟"

توفیق خاموش رہا۔

"میں پوچھتا ہوں خوبصورت ہے؟ اس کے بدن سے آئڈوفارم کی بھینی بھینی بو آتی ہے؟ اس کی گردن دیکھ کر گردن توڑ بخار ہوتا ہے یا نہیں؟" یہ کہتا کہتا میز پر بیٹھ گیا "مینڈک کیوں کو جو نہ کام ہوتا ہے اس کا علاج تو وہ ضرور جانتی ہوگی۔ خدا کے لئے مجھے اس سے ملاؤ ورنہ مجھ پر ہسٹریا کے دورے پڑنے لگیں گے۔"

جمیل نے ریاض کی طرف دیکھا "ریاض اس کو کئی مرتبہ دیکھ چکا ہے۔"

"ریاض کے دیکھنے سے کیا ہوتا ہے۔ اس کو تو اندھ عورتا ہے" نصیر مسکرایا۔

جمیل نے پوچھا "یہ اندھ عورتا کیا ہے؟"

نصیر نے ریاض کے چشمہ لگے چہرے کو گھور کے دیکھا اور جمیل کو جواب دیا "جناب یہ ایک بیماری کا نام ہے، اس کے مریض عورتوں کو نہیں دیکھ سکتے چاہے اصلی پتھر کا چشمہ لگائیں۔"

ریاض مسکرا دیا "شاید اسی لئے مجھے مارگریٹ میں وہ حسن نظر نہ آیا جس کی تعریف میں توفی نے زمین و آسمان کے قلابے ملا رکھے تھے۔"

توفیق نے اپنا جھکا ہوا سر اٹھا کر ریاض سے صرف اتنا پوچھا "کیا وہ حسین نہیں تھی؟"

ریاض نے جواب دیا "ہرگز نہیں۔ صاف ستھری لڑکی البتہ ضرور ہے۔"

"لانڈری سے تازہ تازہ آئی ہوئی شلوار کی طرح؟" نصیر ابھی کچھ اور کہنا چاہتا تھا کہ ریاض بول پڑا "ہاں یار۔ ایک دن اس نے شلوار قمیص پہنی ہوئی تھی۔ ان کپڑوں میں اچھی لگتی تھی۔ میں اور توفی موٹر میں تھے۔ توفی ڈرائیوری کر رہا تھا۔ موٹر ہسپتال کے پھاٹک میں داخل ہوئی تو اسٹیئرنگ توفی کے ہاتھوں کے نیچے پھسلا۔ لڑکی دیکھ کر ہمیشہ اس کی یہی کیفیت ہوتی ہے۔ میں نے سامنے دیکھا تو وہ شلوار قمیص پہنے شکنتلا چلی آ رہی تھی۔ توفی نے موٹر عین اس کے پاس روکی اور کہا۔ گوڈ مورننگ۔ وہ مسکرائی۔ لکھنوی انداز سے دایاں ہاتھ ماتھے تک لے گئی، اور کہا۔ آداب عرض۔۔۔۔ جیسا لباس ویسی بولی ــــ لونڈیا ہے چالاک۔ توفی ابھی کوئی فقرہ موزوں کر رہا تھا کہ وہ چھوٹے چھوٹے مگر تیز قدم اٹھاتی آگے بڑھ گئی۔ توفی نے فقرے کو چھوڑا اور سینے پر دو ہتڑ مار کر کہا۔ مار ڈالا۔ اتنے میں مارگریٹ کا عکس بیک ویو مرر میں نمودار ہوا۔ توفی نے بڑے تھیٹری انداز میں ایک عدد چمّا اس کی طرف پھینکا اور موٹر اسٹارٹ کر دی۔"

"تمہاری اس گفتگو سے ثابت کیا ہوا؟" نصیر نے اپنے گھونگھریالے بالوں کا ایک گچھا مروڑتے ہوئے کہا "بات یہ ہے کہ جب تک یہ خاکسار چشم خود اس لونڈیا کو نہیں دیکھے گا کچھ بھی ثابت نہیں ہوگا۔ جھوٹ بولوں تو توفی ہی کا منہ کالا ہو۔"

توفیق خاموش سگریٹ کے کش لیتا رہا۔

جمیل نے اپنی کرسی ذرا آگے بڑھائی اور ریاض سے پوچھا "اچھا بھئی یہ بتاؤ توفی نے کبھی اُسے موٹر کی سیر نہیں کرائی؟"

ریاض نے جواب دیا "ایک دفعہ اُس نے کہا تھا تو اُس سے مجھے یاد نہیں رہا۔ اس نے کیا جواب دیا تھا۔ بات دراصل یہ ہے کہ توفی کو کھُل کے بات کرنے کا موقعہ ہی نہیں ملا۔ ٹمپریچر لینے یا ٹیکہ لگانے کے لئے آتی ہے تو باپ کی موجودگی میں یہ اس سے کیا بات کر سکتا ہے۔ پھر بھی اشاروں کنایوں میں کچھ نہ کچھ ہو ہی جاتا ہے۔ میرا خیال ہے یہ ادائیں آج صرف اسی لئے ہیں۔ اس کے ابا جان دو تین دنوں میں ہسپتال چھوڑنے والے ہیں، کیونکہ زخم بالکل بھر چکا ہے۔ کیوں توفی؟"

توفیق نے صرف اتنا کہا "مجھے ستاؤ نہیں یار" اور اُٹھ کر باہر باغ میں چلا گیا۔ نصیر نے اپنی تھوڑی ہاتھ میں پکڑی اور چہرے پر گہری فکرمندی کے نشانات پیدا کر کے کہا "کہیں لمڈے کو اِسک تو نہیں ہو گیا۔"

"توفی اور عشق۔ دو متضاد چیزیں" ریاض کرسی پر سے اٹھا اور سنجیدگی سے کہنے لگا "کوئی اور ہی چیز ہوئی ہے حضرت کو۔ میرا خیال ہے لاہور میں اس کا جی لگ گیا تھا۔ والد ٹھیک ہو گئے ہیں، تو اب اسے واپس مری جانا پڑے گا۔"

"بکواس ہے" نصیر چلایا "کوئی اور ہی بات ہے۔ تم یہاں ٹھہرو۔ میں ابھی دریافت کر کے آتا ہوں۔"

نصیر اُٹھ کر باہر چلنے لگا تو جمیل نے اس سے پوچھا "کس سے دریافت کرنے چلے ہو؟"

Donated By
Dr. RAJ BAHADUR GOUR

نصیر مسکرایا۔ "گھوڑے کے منہ سے۔ انگریزی میں فروم دی ہارسز ماؤتھ!" یہ کہہ کر وہ باہر نکل گیا۔

جمیل نے ریاض کی طرف دیکھا اور سنجیدگی سے پوچھا۔ "ہاں بھئی ریاض، یہ سلسلہ کیا ہے۔ توفی ایک دن بہت تعریف کر رہا تھا۔ اس مارگریٹ کی۔ کہتا تھا کہ معاملہ پٹا سمجھو۔ کیا یہ ٹھیک ہے؟"

"ٹھیک ہی ہوگا۔ میرا مطلب ہے ایسا کون سا چتوڑ گڑھ کا قلعہ ہے جو توفی کو سر کرنا ہے۔ ایک دن کوری ڈور میں کافی میٹھی میٹھی باتیں کر رہے تھے؟"

"کیا؟"

"میں نے پاکٹ بک میں نوٹ کی ہوئی ہیں۔ کسی روز پڑھ کے تمہیں سناؤں گا۔"

جمیل کے ہونٹوں پر کھسیانی سی مسکراہٹ پیدا ہوئی۔ "مذاق کرتے ہو یار۔ سناؤ۔ سناؤ کوئی اور بات سناؤ۔ میرا مطلب ہے، یہ بتاؤ کہ میں کبھی اس نرس کو دیکھ سکتا ہوں۔"

"جب چاہو دیکھ سکتے ہو۔ ہسپتال چلے جاؤ۔ فیملی وارڈ میں تمہیں نظر آجائے گی۔ لیکن کیا کرو گے دیکھ کر۔ تمہارا قد بہت چھوٹا ہے۔ تم سے پوری ایک بالشت اونچی ہے۔"

"اس قد نے مجھے کہیں کا نہیں رکھا۔ بہتیرے علاج کروا چکا ہوں۔ ایک سوئی برابر اونچا نہیں ہوا۔ اچھا، میں نے کہا، ریاض — باپ کی موجودگی میں توفی اس سے اشارے بازی کیسے کرتا ہوگا۔ نہیں، لڑکا ہوشیار ہے!"

ریاض نے تاش کی گڈی اٹھائی اور پتے پھینٹنے شروع کئے۔ "بھئی خاصی مصیبت

ہے۔ ہر وقت یہی دھڑکا کہ والد دیکھ نہ لے تاڑ نہ جائے۔ کہتا تھا۔ جونہی ان کی نگاہیں میری طرف اٹھتی تھیں، میں نظریں نیچی کر لیتا تھا۔ جب وہ آتی تھی تو دس پندرہ منٹوں میں غریب کو صرف تین چار موقعے آنکھ لڑانے کو ملتے تھے۔"

جمیل نے پوچھا "ڈی، ایس، پی ہیں نا توفی کے ابا جان۔"

"ہاں بھئی — باپ ہونا ہی کافی ہوتا ہے۔ اوپر سے ڈی، ایس، پی۔"

جمیل نے آہ بھری "میرے تمام رومانس غارت کرنے والے میرے ابا جان ہیں۔ مجھ سے پہلے ان کی غارت گری اتنے زوروں پر نہ تھی، پر جب سے آپ خانہ کعبہ سے واپس تشریف لائے ہیں۔ آپ کی غارت گری عروج پر ہے۔ سوچتا ہوں شادی کر لوں، ایک لڑکا پیدا کروں اور بیٹھا اس سے اپنا انتقام لیتا رہوں۔"

ریاض مسکرایا۔ "حج کرنے جاؤ گے؟"

"ایک نہیں دس دفعہ۔ صاحب زادے کو ساتھ لے کر جاؤں گا۔"

یہ کہہ کر اس نے میز پر زور سے مکا مارا۔ آواز کے ساتھ ہی نصیر داخل ہوا۔ ریاض اور جمیل دونوں اس کی طرف غور سے دیکھنے لگے۔ نصیر انتہائی سنجیدگی کے ساتھ کرسی پر بیٹھ گیا۔ جمیل کے دماغ میں کھد بد ہونے لگی "کچھ دریافت کیا؟"

"سب کچھ۔" نصیر کا جواب مختصر تھا۔

ریاض نے پوچھا۔ "توفی کہاں ہے؟"

نصیر نے جواب دیا۔ "چلا گیا ہے؟"

"کہاں۔" یہ سوال ریاض نے کیا۔

"واپس مری۔"

نصیر کا یہ جواب سُن کر ریاض اور جمیل دونوں بیک وقت بولے "مری واپس؟"

"جی ہاں مری واپس چلا گیا ہے، اپنی موٹر میں۔ ہسپتال سے سیدھا یہاں کلب آیا۔ یہاں سے سیدھا مری روانہ ہو گیا ہے۔"

نصیر نے ایک ایک لفظ چبا چبا کر ادا کیا۔

"آخر ہوا کیا؟"

نصیر نے جواب دیا "حادثہ!"

جمیل اور ریاض دونوں بولے "کیسا حادثہ؟"

"بتاتا ہوں" یہ کہہ کر نصیر نے جیب سے سگریٹ کی ڈبیا نکالی جس میں کوئی سگریٹ نہیں تھا۔ ڈبیا ایک طرف پھینک کر وہ ریاض اور جمیل سے مخاطب ہوا۔

"معاملہ بہت سنگین ہے۔"

جمیل نے ریاض سے کہا "میرا خیال ہے توفی پکڑا گیا ہوگا!"

ریاض نے کہا "معلوم ایسا ہی ہوتا ہے۔ آدمی کب تک کسی کی آنکھوں میں دھول جھونک سکتا ہے۔ ڈی ایس پی ہے۔ فوراً تاڑ گیا ہوگا۔ لیکن نصیر تم بتاؤ توفی نے تم سے کیا کہا؟"

"بتاتا ہوں۔ ایک سگریٹ دینا جمیل۔"

جمیل نے اس کو سگریٹ دیا اُسے سُلگا کر اُس نے بات شروع کی: باپ کی موجودگی میں اس کی نرس سے اشارہ بازی ہوتی تھی۔ یہ تم لوگوں کو معلوم ہے یہ سلسلہ اشارہ بازی کا بہت دنوں سے جاری تھا۔ توفی اس میں خاصا کامیاب

رہا تھا۔ باپ کی موجودگی کے باعث اسے بہت زیادہ محتاط رہنا پڑتا تھا۔ وہ ذرا گردن گھماتے تو یہ فوراً اپنی آنکھیں نیچی کر لیتا۔ ان دقتوں کے باوجود اس نے لڑکی سے ربط بڑھا ہی لیا۔ آف ڈیوٹی کے روز شام کو وہ اسے ایک مرتبہ سینما بھی لے گیا۔

جمیل گنگا "واہ!"

ریاض نے کہا "مجھ سے اس نے اس کا ذکر نہیں کیا۔"

نصیر نے سگریٹ کا کش لیا "سینما میں وہ خوب ایک دوسرے کے ساتھ گھل مل گئے۔ نرس کو توفی کا چنچل پنا بہت پسند آیا۔ پرسوں کی ملاقات میں آج کی شام طے ہوئی کہ وہ توفی کے ساتھ دور تک موٹر میں سیر کرنے چلے گی، اور توفی اپنی عادت سے مجبور ہو کر اگر کوئی شرارت کرنا چاہے گا تو وہ برا نہ مانے گی۔"

جمیل پھر گنگا "واہ!"

ریاض نے اسے ٹوکا "خاموش رہو جمیل"

نصیر نے سگریٹ کا ایک لمبا کش لیا "پرسوں کی ملاقات میں جو کچھ طے ہوا تھا میں آپ کو بتا چکا ہوں۔ توفی بہت خوش تھا۔ اپنے خیال کے مطابق وہ ایک بہت بڑا میدان مارنے والا تھا۔ آج دن بھر وہ اسکیمیں بناتا رہا۔ پٹرول کا انتظام اس نے کر لیا۔

کرم الٰہی نے اسے چھ کوپن دے دیئے تھے۔ اس کی پرمٹ پر بیئر کی چھ بوتلیں بھی حاصل کر لی تھیں جو غالباً ابھی تک امتیاز کے فرجڈیئر میں ٹھنڈی ہو رہی ہیں۔ توفی کی اسکیم یہ تھی کہ چنیوٹ کے پل تک چلیں گے۔ حسن و عشق کے دریا، چناب کی لہروں میں ہوں گی۔ موسم بھی خوشگوار ہوگا۔ گلاس راستے میں خرید لیں گے۔

ٹھنڈی ٹھنڈی بیئر اڑے گی۔ خوب سرور جمیں گے۔۔۔۔ لیکن۔۔۔۔۔"

یہ کہہ کر نصیر ایک دم خاموش ہو گیا۔

جمیل نے بے چین ہو کر پوچھا "سارا معاملہ غارت ہو گیا؟"

نصیر نے اثبات میں سر ہلایا "سارا معاملہ غارت ہو گیا؟

جمیل نے اور زیادہ بے چین ہو کر پوچھا "کیسے؟"

نصیر نے سگریٹ کی گرد ایش ٹرے میں دبائی اور کہا "پروگرام یہ تھا کہ وہ شام کو چھ بجے ہسپتال جائے گا۔ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ اپنے باپ کے پاس بیٹھے گا۔ اس دوران میں جب مارگریٹ آئے گی تو وہ سیر کی بات پکی کر لے گا۔ بات پکی ہو جائے گی تو وہ سیدھا امتیاز کے ہاں جائے گا۔ کچھ دیر وہاں بیٹھے گا بیئر کی ایک بوتل پیئے گا۔ باقی پانچ موٹر میں رکھے گا اور جو جگہ مقرر ہوئی ہو گی۔ وہاں مارگریٹ سے جا ملے گا۔ دل و دماغ سخت بے چین تھا۔ گھر سے وقت سے کچھ پہلے ہی نکل آیا۔ ہسپتال پہنچا۔ موٹر ایک طرف کھڑی کی۔ وارڈ کی طرف چلا سیڑھیاں طے کیں اوپر پہنچا۔ کمرے کا دروازہ کھولا تو دیکھتا ہے۔۔۔۔"

نصیر ایک دم رک گیا۔ جمیل اور ریاض دونوں بیک وقت بولے "کیا دیکھتا ہے۔؟"

"دیکھتا ہے کہ ٹھہرو" نصیر تھوڑی دیر کے لیے رکا۔ "میں تو فی کے الفاظ میں بیان کرتا ہوں۔ میں نے کمرے کا دروازہ کھولا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ مارگریٹ پلنگ پر جھکی ہوئی ہے اور والد صاحب اس کے ہونٹ چوس رہے ہیں۔"

"جمیل اور ریاض قریب قریب اچھل پڑے۔ "سچ؟"

Donated By
RAI BAHADUR GOUR

نصیر نے جواب دیا۔ "دروغ بر گردنِ راوی"

جمیل جس کے دماغ پر حیرت مسلط تھی بڑبڑایا۔ "کمال کر دیا۔ ڈی، ایس، پی صاحب نے۔"

ریاض نے نصیر سے پوچھا۔ "تو فی نے کیا کیا؟"

نصیر نے جواب دیا۔ "آنکھیں نیچی کر لیں اور چلا آیا۔"

جمیل ریاض سے مخاطب ہوا۔ "میرے والد صاحب قبلہ کبھی ایسے نظارے کا موقع دیں تو مزا آجائے۔ پتہ نہیں تو فی کیوں اس قدر پریشان تھا؟"

نصیر نے کہا۔ "تو فی کی والدہ صاحبہ اس کے ساتھ تھیں۔ تو فی نے مجھ سے کہا میں تو نظریں نیچی کر کے چلدیا۔ لیکن امی جان دروازہ کھول کر اندر کمرے میں چلی گئیں۔"

جمیل نے پُر افسوس لہجے میں کہا۔ "قبلہ والد صاحب کے ساتھ یہ زیادتی ہوئی ــــ!"

۲ر جون ۱۹۵۰ء

عورت ذات

مہاراجہ گت سے ریس کورس پر اشوک کی ملاقات ہوئی۔ اس کے بعد دونوں بے تکلف دوست بن گئے

مہاراجہ گت کو ریس کے گھوڑے پالنے کا شوق ہی نہیں خبط تھا۔ اس کے اصطبل میں اچھی سے اچھی نسل کا گھوڑا موجود تھا اور محل میں جس کے گنبد ریس کورس سے صاف دکھائی دیتے تھے، طرح طرح کے عجائب موجود تھے۔

اشوک جب پہلی بار محل میں گیا تو مہاراجہ گت نے کئی گھنٹے صرف کر کے اس کو اپنے تمام نوادر دکھائے۔ یہ چیزیں جمع کرنے میں مہاراجہ کو سارے دنیا کا دورہ کرنا پڑا تھا۔ ہر ملک کا کونہ کونہ چھاننا پڑا تھا۔

اشوک بہت متاثر ہوا۔ چنانچہ اس نے نوجوان مہاراجہ کے ذوق انتخاب کی خوب داد دی۔

ایک دن اشوک گھوڑوں کے لینے کے لئے مہاراجہ کے پاس گیا۔ تو وہ ڈارک روم میں فلم دیکھ رہا تھا۔ اس نے اشوک کو وہیں بلوا لیا۔ سکسٹین ملی میٹر فلم تھے جو مہاراجہ نے خود اپنے کیمرے سے لئے تھے جب پروجیکٹر چلا تو پچھلی ریس پوری کی پوری پردے پر دوڑ گئی۔ مہاراجہ کا گھوڑا اس ریس میں دن آیا تھا۔

اس فلم کے بعد مہاراجہ نے اشوک کی فرمائش پر اور کئی فلم دکھائے سوئیزرلینڈ، پیرس، نیویارک، ہونولولو، ہوائی، وادیٔ کشمیر۔ اشوک بہت محظوظ ہوا یہ فلم قدرتی رنگوں میں تھے۔

اشوک کے پاس بھی سکسٹین ملی میٹر کیمرہ اور پروجیکٹر تھا مگر اس کے پاس فلموں کا اتنا ذخیرہ نہیں تھا۔ دراصل اس کو اتنی فرصت ہی نہیں ملتی تھی کہ اپنا یہ شوق جی بھر کے پورا کر سکے۔

مہاراجہ جب کچھ فلم دکھا چکا تو اس نے کمرے میں روشنی کی اور بڑی بے تکلفی سے اشوک کی ران پر دھپا مار کر کہا۔ "اور سناؤ دوست"

اشوک نے سگریٹ سلگایا "مزا آ گیا فلم دیکھ کر"

"اور دکھاؤں"

"نہیں، نہیں"

"نہیں بھئی ایک ضرور دیکھو۔ مزا آ جائے گا تمہیں" یہ کہہ کر مہاراجہ

گ نے ایک صندوقچہ کھول کر ایک ریل نکالی اور پروجیکٹر پر چڑھا دی۔ "ذرا اطمینان سے دیکھنا۔"

اشوک نے پوچھا۔ "کیا مطلب؟"

مہاراجہ نے کمرے کی لائٹ اوف کر دی۔ "مطلب یہ کہ ہر چیز غور سے دیکھنا۔" کہہ کر اس نے پروجیکٹر کا سوئچ دبا دیا۔

پردے پر چند لمحات صرف سفید روشنی تھرتھراتی رہی، پھر ایکدم تصویریں شروع ہو گئیں۔ ایک الف ننگی عورت صوفے پر لیٹی تھی۔ دوسری سنگار میز کے پاس کھڑی بال سنوار رہی تھی۔

اشوک کچھ دیر خاموش بیٹھا دیکھتا رہا۔ اس کے بعد ایکدم اس کے حلق سے عجیب و غریب آواز نکلی۔ مہاراجہ نے ہنس کر اس سے پوچھا "کیا ہوا؟"

اشوک کے حلق سے آواز پھنس پھنس کر باہر نکلی۔ "بند کرو یار بند کرو۔"

"کیا بند کرو؟"

اشوک اٹھنے لگا، مگر مہاراجہ گ نے اسے پکڑ کر بٹھا دیا۔ "یہ فلم تمہیں پورے کا پورا دیکھنا پڑے گا۔"

فلم چلتا رہا، پردے پر برہنگی منہ کھولے ناچتی رہی، مرد اور عورت کا جنسی رشتہ مادر زاد عریانی کے ساتھ تھرکتا رہا، اشوک نے سارا وقت بیچینی میں کاٹا جب فلم بند ہوا اور پردے پر صرف سفید روشنی تھی تو اشوک کو ایسا محسوس ہوا کہ جو کچھ اس نے دیکھا تھا پروجیکٹر کی بجائے اس کی آنکھیں

پھینک رہی ہیں۔

مہاراجہ گ نے کمرے کی لائٹ اون کی اور اشوک کی طرف دیکھا اور ایک زور کا قہقہہ لگایا۔ "کیا ہو گیا ہے تمہیں؟"

اشوک کچھ سکڑ سا گیا تھا۔ ایک دم روشنی ہونے کے باعث اس کی آنکھیں بھینچی ہوئی تھیں۔ ماتھے پر پسینے کے موٹے موٹے قطرے تھے مہاراجہ گ نے زور سے اس کی ران پر دھپا مارا اور اس قدر بے تحاشا ہنسا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اشوک صوفے پر سے اٹھا رومال نکال کر اپنے ماتھے کا پسینہ پونچھا۔ "کچھ نہیں یار۔"

"کچھ نہیں کیا۔ مزا نہیں آیا۔"

اشوک کا حلق سوکھا ہوا تھا۔ تھوک نگل کر اس نے کہا۔ "کہاں سے لائے یہ فلم؟"

مہاراجہ نے صوفے پر لیٹتے ہوئے جواب دیا "پیرس سے۔ پے ری — پے ری!"

اشوک نے سر کو جھٹکا سا دیا۔ "کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔"

"کیا؟"

"یہ لوگ۔ میرا مطلب ہے کیمرے کے سامنے یہ لوگ کیسے ....."

"یہی تو کمال ہے — ہے کہ نہیں؟"

"یہ ہے تو سہی" یہ کہہ کر اشوک نے رومال سے اپنی آنکھیں صاف کیں۔ "ساری تصویریں جیسے میری آنکھوں میں پھنس سی گئی ہیں۔"

مہاراجہ گ اٹھا" میں نے ایک دفعہ چند لیڈیز کو یہ فلم دکھایا"
اشوک چلایا" لیڈیز کو؟"
"ہاں ہاں۔ بڑے مزے لے لے کر دیکھا انہوں نے"
"غلط"
مہاراجہ نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ کہا "سچ کہتا ہوں۔ ایک دفعہ دیکھ کر دوسری دفعہ پھر دیکھا۔ چیختی چلاتی اور ہنستی رہیں"
اشوک نے اپنے سر کو جھٹکا سا دیا "مد ہو گئی ہے، میں تو سمجھتا تھا وہ بیہوش ہو گئی ہوں گی"
"میرا بھی یہی خیال تھا، لیکن انہوں نے خوب لطف اٹھایا"
اشوک نے کہا "کیا یورپین تھیں؟"
مہاراجہ گ نے کہا "نہیں بھائی۔ اپنے دیس کی تھیں۔ مجھ سے کئی بار یہ فلم اور پروجیکٹر مانگ کر لے گئیں۔ معلوم نہیں کتنی سہیلیوں کو دکھا چکی ہیں"
"میں نے کہا" اشوک کچھ کہتے کہتے رک گیا۔
"کیا؟"
"ایک دو روز کے لئے یہ فلم دے سکتے ہو مجھے؟"
"ہاں ہاں لے جاؤ" یہ کہہ کر مہاراجہ نے اشوک کی پسلیوں میں ٹھونکا دیا۔ "سالے کس کو دکھائے گا"
"دوستوں کو"
"دکھا، جس کو بھی تیری مرضی!" یہ کہہ کر مہاراجہ گ نے پروجیکٹر میں سے

فلم کا اسپول نکالا اس کو دوسرے اسپول پر چڑھا دیا اور ڈبہ اشوک کے حوالے کر دیا۔ "لے پکڑ۔ عیش کر!"

اشوک نے ڈبہ ہاتھ میں لے لیا۔ تو اس کے بدن میں جھرجھری سی دوڑ گئی۔ گھوڑوں کے ٹپ لینا بھول گیا اور چند منٹ ادھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد چلا گیا۔

گھر سے پروجیکٹر لے جا کر اس نے کئی دوستوں کو یہ فلم دکھایا۔ تقریباً سب کے لئے انسانیت کی یہ عریانی بالکل نئی چیز تھی، اشوک نے ہر ایک کا ردِ عمل نوٹ کیا۔ بعض نے خفیف سی گھبراہٹ اور فلم کا ایک ایک انچ غور سے دیکھا۔ بعض نے تھوڑا سا دیکھ کر آنکھیں بند کر لیں۔ بعض آنکھیں کھلی رکھنے کے باوجود فلم کو تمام و کمال طور پر نہ دیکھ سکے۔ ایک برداشت نہ کر سکا اور اٹھ کر چلا گیا۔

تین چار روز کے بعد اشوک کو فلم لوٹانے کا خیال آیا تو اس نے سوچا۔ کیوں نہ اپنی بیوی کو دکھاؤں چنانچہ وہ پروجیکٹر اپنے گھر لے گیا۔ رات ہوئی تو اس نے اپنی بیوی کو بلایا، دروازے بند کئے پروجیکٹر کا کنکشن وغیرہ ٹھیک کیا۔ فلم نکالا۔ اس کو فٹ کیا۔ کمرے کی بتی بجھائی اور فلم چلا دیا۔

پردے پر چند لمحات سفید روشنی تھرتھرائی پھر تصویریں شروع ہوئیں۔ اشوک کی بیوی زور سے چیخی، تڑپی، اُچھلی، اس کے منہ سے عجیب و غریب آوازیں نکلیں۔ اشوک نے اسے پکڑ کر بٹھانا چاہا تو اس نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ لئے اور چیخنا شروع کر دیا۔ "بند کرو۔ بند کرو"

اشوک نے ہنس کر کہا: "ارے بھئی دیکھ لو۔ شرماتی کیوں ہو۔"

"نہیں نہیں۔" یہ کہہ کر اس نے ہاتھ چھڑا کر بھاگنا چاہا۔

اشوک نے اس کو زور سے پکڑ لیا، وہ ہاتھ جو اس کی آنکھوں پر تھا ایک طرف کھینچا، اس کھینچا تانی میں دفعتاً اشوک کی بیوی نے رونا شروع کر دیا اشوک کے بریک سے لگ گئی، اس نے تو محض تفریح کی خاطر اپنی بیوی کو فلم دکھایا تھا۔

روتی اور بڑبڑاتی اس کی بیوی دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔ اشوک چند لمحات بالکل خالی الذہن بیٹھا ننگی تصویریں دیکھتا رہا جو حیوانی حرکات میں مشغول تھیں۔ پھر ایک دم اس نے معاملے کی نزاکت کو محسوس کیا۔ اس احساس نے اسے خجالت کے سمندر میں غرق کر دیا۔ اس نے سوچا مجھ سے بہت ہی نازیبا حرکت سرزد ہوئی۔ لیکن حیرت ہے کہ مجھے اس کا خیال تک نہ آیا۔ دوستوں کو دکھایا تھا، ٹھیک تھا، گھر میں اور کسی کو نہیں اپنی بیوی کو، ..... اس کے ماتھے پر پسینہ آ گیا۔

فلم چل رہا تھا، مادرزاد برہنگی مختلف آسن اختیار کرتی دوڑ رہی تھی، اشوک نے اٹھ کر سوئچ اوف کر دیا۔ پردے پر سب کچھ بجھ گیا، مگر اس نے اپنی نگاہیں دوسری طرف پھیر لیں، اس کا دل، دماغ شرمساری میں ڈوبا ہوا تھا۔ یہ احساس اس کو چبھ رہا تھا کہ اس سے ایک نہایت ہی نازیبا، نہایت ہی واہیات حرکت سرزد ہوئی ہے اس نے یہاں تک سوچا کہ وہ کیسے اپنی بیوی سے آنکھ ملا سکے گا۔

کمرے میں گھپ اندھیرا تھا۔ ایک سگریٹ سلگا کر اس نے احساس ندامت کو مختلف خیالوں کے ذریعے سے دور کرنے کی کوشش کی، مگر کامیاب نہ ہوا تھوڑی دیر دماغ میں ادھر ادھر ہاتھ مارتا رہا۔ جب چاروں طرف سے سرزنش ہی سرزنش ہوئی تو زچ ہو گیا، اور ایک عجیب سی خواہش اس کے دل میں پیدا ہوئی کہ جس طرح کمرے میں اندھیرا ہے اسی طرح اس کے دماغ پر بھی اندھیرا چھا جائے۔

بار بار اسے یہ چیز ستا رہی تھی، ایسی واہیات حرکت اور مجھے خیال تک نہ آیا۔

پھر وہ سوچتا بات اگر ساس تک پہنچ گئی۔ سالیوں کو پتہ چل گیا۔ میرے متعلق کیا رائے قائم کریں گے۔ یہ لوگ کہ ایسے گرے ہوئے اخلاق کا آدمی نکلا۔ ایسی گندی ذہنیت کہ اپنی بیوی کو۔۔۔

تنگ آ کر اشوک نے سگریٹ سلگایا، وہ ننگی تصویریں جو وہ کئی بار دیکھ چکا تھا اس کی آنکھوں کے سامنے ناچنے لگیں۔ ان کے عقب اسے اپنی بیوی کا چہرہ نظر آتا۔ حیران و پریشان جس نے زندگی میں پہلی بار عفونت کا اتنا بڑا ڈھیر دیکھا ہو، سر جھٹک کر اشوک اٹھا اور کمرے میں ٹہلنے لگا۔ مگر اس سے بھی اس کا اضطراب دور نہ ہوا۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ دبے پاؤں کمرے سے باہر نکلا، ساتھ والے کمرے میں جھانک کر دیکھا۔ اس کی بیوی منہ سر لپیٹ کر لیٹی ہوئی تھی کافی دیر کھڑا سوچتا رہا کہ اندر جا کر مناسب و موزوں الفاظ میں اس سے

معافی مانگے، مگر خود میں اتنی جرأت پیدا نہ کر سکا۔ دبے پاؤں لوٹا اور اندھیرے کمرے میں صوفے پر لیٹ گیا، دیر تک جاگتا رہا، آخر سو گیا،

صبح سویرے اٹھا، رات کا واقعہ اس کے ذہن میں تازہ ہو گیا، اشوک نے بیوی سے ملنا مناسب نہ سمجھا اور ناشتہ کئے بغیر نکل گیا، آفس میں اُس نے دل لگا کر کوئی کام نہ کیا۔ یہ احساس اس کے دل و دماغ کے ساتھ چپک کر رہ گیا تھا "ایسی واہیات حرکت اور مجھے خیال تک نہ آیا"

کئی بار اس نے گھر بیوی کو ٹیلی فون کرنے کا ارادہ کیا مگر ہر بار نمبر کے آدھے ہندسے گھما کر ریسیور رکھ دیا۔ دوپہر کو گھر سے جب اس کا کھانا آیا تو اس نے نوکر سے پوچھا "میم صاحب نے کھانا کھا لیا۔"

نوکر نے جواب دیا "جی نہیں۔ وہ کہیں باہر گئے ہیں۔"

"کہاں؟"

"معلوم نہیں صاحب!"

"کب گئے تھے؟"

"گیارہ بجے۔"

اشوک کا دل دھڑکنے لگا۔ بھوک غائب ہو گئی۔ دو چار نوالے کھائے اور ہاتھ اٹھا لیا۔ اس کے دماغ میں ہلچل مچ گئی تھی۔ طرح طرح کے خیالات پیدا ہو رہے تھے "گیارہ بجے۔ ابھی تک لوٹی نہیں۔ گئی کہاں ہے۔ ماں کے پاس؟ کیا وہ اسے سب بتا دے گی؟ ضرور بتائے گی۔ ماں سے بیٹی سب کچھ کہہ سکتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ بہنوں کے پاس گئی ہو۔ سنیں گی تو کیا کہیں گی؟

ــ دونوں میری کتنی عزت کرتی تھیں، جانے بات کہاں سے کہاں پہنچے گی۔ ایسی واہیات حرکت اور مجھے خیال تک نہ آیا۔"

اشوک آفس سے باہر نکل گیا، موٹر لی اور ادھر ادھر آوارہ چکر لگاتا رہا۔ جب کچھ سمجھ میں نہ آیا تو اس نے موٹر کا رُخ گھر کی طرف پھیر دیا۔ "دیکھا جائے گا جو کچھ ہوگا۔"

گھر کے پاس پہنچا تو اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ جب لفٹ ایک دھچکے کے ساتھ اوپر اٹھی تو اس کا دل اچھل کر اس کے منہ میں آ گیا۔

لفٹ تیسری منزل پر رُکی، کچھ دیر سوچ کر اس نے دروازہ کھولا اپنے فلیٹ کے پاس پہنچا تو اس کے قدم رُک گئے اس نے سوچا کہ لوٹ جائے، مگر فلیٹ کا دروازہ کھلا اور اس کا نوکر بیڑی پینے کے لئے باہر نکلا اشوک کو دیکھ کر اس نے بیڑی ہاتھ میں چھپا لی اور سلام کیا، اشوک کو اندر داخل ہونا پڑا۔

نوکر پیچھے پیچھے آ رہا تھا، اشوک نے پلٹ کر اس سے پوچھا ــــ

"میم صاحب کہاں ہیں؟"

نوکر نے جواب دیا "اندر کمرے میں ہیں!"

"اور کون ہے؟"

"ان کی بہنیں صاحب ــ کولابے والے صاحب کی میم صاحب اور دو پارسی باتیاں!"

یہ سن کر اشوک بڑے کمرے کی طرف بڑھا۔ دروازہ بند تھا۔ اس نے

دھکا دیا۔ اندر سے اشوک کی بیوی کی پتلی مگر تیز آواز آئی "کون ہے؟"

نوکر بولا "صاحب"

اندر کمرے میں ایک دم گڑبڑ شروع ہو گئی چیخیں بلند ہوئیں۔ دروازوں کی چٹخنیاں کھلنے کی آوازیں آئیں، کھٹ کھٹ، پھٹ پھٹ ہوئی۔ اشوک کوری دوڑ سے ہوتا پچھلے دروازے سے کمرے میں داخل ہوا تو اس نے دیکھا کہ پروجیکٹر چل رہا ہے اور پردے پر دن کی روشنی میں دھندلی دھندلی انسانی شکلیں ایک نفرت انگیز ہیجان کی ایک آہنگی کے ساتھ حیوانی حرکات میں مشغول ہیں۔

اشوک بے تحاشہ ہنسنے لگا۔

۴ رجون ۱۹۵۵ء

عشقِ حقیقی

عشق و محبت کے بارے میں اخلاق کا نظریہ وہی تھا جو اکثر عاشقوں اور محبت کرنے والوں کا ہوتا ہے۔ وہ رانجھے پیر کا چیلا تھا عشق میں مرجانا اس کے نزدیک ایک عظیم الشان موت مرنا تھا۔

اخلاق تیس برس کا ہو گیا مگر باوجود کوششوں کے اس کو کسی سے عشق نہ ہوا۔ لیکن ایک دن انگرڈ برگ مین کی پکچر "فور ہوم دی بل ٹولز" کا میٹنی شو دیکھنے کے دوران میں اس نے محسوس کیا کہ اس کا دل اس برقعہ پوش لڑکی سے وابستہ ہو گیا ہے جو اس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھی تھی اور سارا وقت اپنی ٹانگ ہلاتی رہی تھی۔

پردے پر جب سائے کم اور روشنی زیادہ ہوئی تو اخلاق نے اس

لڑکی کو ایک نظر دیکھا۔ اس کے ماتھے پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے تھے۔ ناک کی پھننگ پر چند بوندیں تھیں۔ جب اخلاق نے اس کی طرف دیکھا تو اس کی ٹانگ ہلنا بند ہو گئی۔ ایک ادا کے ساتھ اس نے اپنے سیاہ برقعے کی جالی سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا۔ یہ حرکت کچھ ایسی تھی کہ اخلاق کو بے اختیار ہنسی آ گئی۔

اس لڑکی نے اپنی سہیلی کے کان میں کچھ کہا، دونوں ہولے ہولے ہنسیں اس کے بعد اس لڑکی نے نقاب اپنے چہرے سے ہٹا لی۔ اخلاق کی طرف تیکھی تیکھی نظروں سے دیکھا اور ٹانگ ہلا کر فلم دیکھنے میں مشغول ہو گئی۔

اخلاق سگریٹ پی رہا تھا۔ انگرڈ برگ مین اس کی محبوب ایکٹرس تھی۔ "ہوم دی بلا ٹولز" میں اس کے بال کٹے ہوئے تھے۔ فلم کے آغاز میں جب اخلاق نے اُسے دیکھا تو وہ بہت ہی پیاری معلوم ہوئی۔ لیکن ساتھ والی سیٹ پر بیٹھی ہوئی لڑکی دیکھنے کے بعد وہ انگرڈ برگ مین کو بھول گیا۔ یوں تو قریب قریب سارا فلم اس کی نگاہوں کے سامنے چلا مگر اس نے بہت کم دیکھا۔

سارا وقت وہ لڑکی اس کے دل و دماغ چھائی رہی۔

اخلاق سگریٹ پر سگریٹ پیتا رہا۔ ایک مرتبہ اس نے راکھ جھاڑی۔ تو اس کا سگریٹ انگلیوں سے نکل کر اس لڑکی کی گود میں جا پڑا۔ لڑکی فلم دیکھنے میں مشغول تھی، اس لئے اس کو سگریٹ گرنے کا کچھ پتا نہ تھا۔ اخلاق بہت گھبرایا۔ اسی گھبراہٹ میں اس نے ہاتھ بڑھا کر سگریٹ اس کے برقعے پر سے اٹھایا اور فرش پر پھینک دیا۔ لڑکی ہڑبڑا کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اخلاق نے

فوراً کہا "معافی چاہتا ہوں۔ آپ پر سگریٹ گر گیا تھا۔"

لڑکی نے تیکھی تیکھی نظروں سے اخلاق کی طرف دیکھا اور بیٹھ گئی۔ بیٹھ کر اس نے اپنی سہیلی سے سرگوشی میں کچھ کہا۔ دونوں ہولے ہولے ہنسیں۔ اور فلم دیکھنے میں مشغول ہو گئیں۔

فلم کے اختتام پر جب قائداعظم کی تصویر نمودار ہوئی تو اخلاق اٹھا۔ خدا معلوم کیا ہوا کہ اس کا پاؤں اس لڑکی کے پاؤں کے ساتھ ٹکرایا۔ اخلاق ایک بار پھر سرتاپا معذرت بن گیا "معافی چاہتا ہوں۔ جانے آج کیا ہو گیا ہے۔"

دونوں سہیلیاں ہولے ہولے ہنسیں۔ جب بھیڑ کے ساتھ باہر نکلیں تو اخلاق ان کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ وہ لڑکی جس سے اس کی پہلی نظر کا عشق ہوا تھا۔ مڑ مڑ کر دیکھتی رہی۔ اخلاق نے اس کی پرواہ نہ کی۔ اور ان کے پیچھے پیچھے چلتا رہا اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ اس لڑکی کا مکان دیکھ کے رہے گا۔

مال روڈ کے فٹ پاتھ پر وائی، ایم، سی، اے کے سامنے اس لڑکی نے مڑ کر اخلاق کی طرف دیکھا۔ اور اپنی سہیلی کا ہاتھ پکڑ کر رک گئی۔ اخلاق نے آگے نکلنا چاہا تو وہ لڑکی اس سے مخاطب ہوئی "آپ ہمارے پیچھے پیچھے کیوں آ رہے ہیں؟"

اخلاق نے ایک لحظہ سوچ کر جواب دیا "آپ میرے آگے آگے کیوں جا رہی ہیں۔"

لڑکی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اس کے بعد اس نے اپنی سہیلی سے کچھ کہا۔ پھر دونوں چل پڑیں۔ بس اسٹینڈ کے پاس اس لڑکی نے جب مڑ کر دیکھا تو اخلاق نے کہا۔ "آپ پیچھے آ جائیے میں آگے بڑھ جاتا ہوں۔"

لڑکی نے منہ موڑ لیا۔

انار کلی کا موڑ آیا تو دونوں سہیلیاں ٹھہر گئیں۔ اخلاق پاس سے گذرنے لگا تو اس لڑکی نے اس سے کہا "آپ ہمارے پیچھے نہ آئیے۔ یہ بہت بری بات ہے۔"

لہجے میں بہت سنجیدگی تھی۔ اخلاق نے بہت بہتر کہا اور واپس چلدیا۔ اس نے مڑ کر بھی ان کو نہ دیکھا لیکن دل میں اس کو افسوس تھا کہ وہ کیوں اس کے پیچھے نہ گیا۔ اتنی دیر کے بعد اس کو اتنی شدت سے محسوس ہوا تھا کہ اس کو کسی سے محبت ہوئی ہے، لیکن اس نے موقعہ ہاتھ سے جانے دیا، اب خدا معلوم پھر اس لڑکی سے ملاقات ہو یا نہ ہو۔

جب وائی، ایم، سی، اے کے پاس پہنچا تو رک کر اس نے انار کلی کے موڑ کی طرف دیکھا۔ مگر اب وہاں کیا تھا۔ وہ تو اسی وقت انار کلی کی طرف چلی گئی تھیں۔

لڑکی کے نقش بڑے پتلے پتلے تھے۔ باریک ناک چھوٹی سی ٹھوڑی پھول کی پتیوں جیسے ہونٹ۔ جب پردے پر سائے کم اور روشنی زیادہ ہوتی تھی تو اس نے اس کے بالائی ہونٹ پر ایک تل دیکھا تھا، جو بیحد پیارا لگتا تھا۔ اخلاق نے سوچا تھا کہ اگر یہ تل نہ ہوتا تو شاید وہ لڑکی نامکمل رہتی۔ اس کا وہاں پر ہونا اشد ضروری تھا۔

چھوٹے چھوٹے قدم تھے جن میں کنوارپن تھا۔ چونکہ اس کو معلوم تھا کہ ایک مرد میرے پیچھے پیچھے آرہا ہے۔ اس لئے ان کے ان چھوٹے چھوٹے قدموں میں ایک بڑی پیاری لڑکھڑاہٹ سی پیدا ہوگئی تھی۔ اس کا مڑ مڑ کر تو دیکھنا غضب تھا

گردن کو ایک خفیف سا جھٹکا دے کر وہ پیچھے اخلاق کی طرف دیکھتی اور تیزی سے موڑ لیتی۔

دوسرے روز انگرڈ برگ مین کا فلم پھر دیکھنے گیا۔ شو شروع ہو چکا تھا۔ والٹ ڈزنی کا کارٹون چل رہا تھا کہ وہ اندر ہال میں داخل ہوا۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ گیٹ کیپر کی بیٹری کی اندھی روشنی کے سہارے اس نے ٹٹول ٹٹول کر ایک خالی سیٹ تلاش کی اور اس پر بیٹھ گیا۔

ڈزنی کا کارٹون بہت مزاحیہ تھا۔ اِدھر اُدھر کئی تماشائی ہنس رہے تھے۔ دفعتاً بہت ہی قریب سے اخلاق کو ایسی ہنسی سنائی دی جس کو وہ پہچانتا تھا۔ مڑ کر اس نے پیچھے دیکھا تو وہی لڑکی بیٹھی تھی۔

اخلاق کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ لڑکی کے ساتھ ایک نوجوان لڑکا بیٹھا تھا۔ شکل و صورت کے اعتبار سے وہ اس کا بھائی لگتا تھا۔ اِس کی موجودگی میں وہ کس طرح بار بار مڑ کر دیکھ سکتا تھا۔

اِنٹرول ہو گیا۔ اخلاق کوشش کے باوجود فلم اچھی طرح نہ دیکھ سکا۔ روشنی ہوئی تو وہ اٹھا۔ لڑکی کے چہرے پر نقاب تھا۔ مگر اس مہین پردے کے پیچھے اِس کی آنکھیں اخلاق کو نظر آئیں جن میں مسکراہٹ کی چمک تھی۔

لڑکی کے بھائی نے سگریٹ نکال کر سلگایا۔ اخلاق نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ اور اس سے مخاطب ہوا "ذرا ماچس عنایت فرمائیے"

لڑکی کے بھائی نے اس کو ماچس دے دی۔ اخلاق نے اپنا سگریٹ سلگایا۔ اور ماچس اُس کو واپس دے دی "شکریہ"

لڑکی کی ٹانگ ہل رہی تھی۔ اخلاق اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ فلم کا بقایا حصہ شروع ہوا۔ ایک دو مرتبہ اس نے مڑ کر لڑکی کی طرف دیکھا۔ اس سے زیادہ وہ کچھ نہ کر سکا۔

فلم ختم ہوا۔ لوگ باہر نکلنے شروع ہوئے۔ لڑکی اور اس کا بھائی ساتھ ساتھ تھے۔ اخلاق ان سے ہٹ کر پیچھے پیچھے چلنے لگا۔

اسٹینڈرڈ کے پاس بھائی نے اپنی بہن سے کچھ کہا۔ ایک ٹانگے والے کو بلایا۔ لڑکی اس میں بیٹھ گئی۔ لڑکا اسٹینڈرڈ میں چلا گیا۔ لڑکی نے نقاب میں سے اخلاق کی طرف دیکھا۔ اس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ ٹانگہ چل پڑا اسٹینڈرڈ کے باہر اس کے تین چار دوست کھڑے تھے۔ ان میں سے ایک کی سائیکل اس نے جلدی جلدی پکڑی اور ٹانگے کے تعاقب میں روانہ ہو گیا

یہ تعاقب بڑا دلچسپ رہا۔ زور کی ہوا چل رہی تھی لڑکی کے چہرے پر سے نقاب اُٹھ اُٹھ جاتی۔ سیاہ جارجٹ کا پردہ پھڑ پھڑا پھڑ پھڑا کر اس کے سفید چہرے کی جھلکیاں دکھاتا تھا۔ کانوں میں سونے کے بڑے بڑے جھومر تھے، پتلے پتلے ہونٹوں پر سیاہی مائل سُرخی تھی۔ اور بالائی ہونٹ پر تل ــ وہ اشد ضروری تل۔

بڑے زور کا جھونکا آیا تو اخلاق کے سر پر سے ہیٹ اُتر گیا اور سڑک پر لوٹنے لگا۔ ایک ٹرک گزر رہا تھا۔ اس کے فولادی پہیئے کے نیچے آیا اور وہیں چت ہو گیا۔ لڑکی ہنسی۔ اخلاق مسکرا دیا۔ گردن موڑ کر ہیٹ کی لاش دیکھی جو بہت پیچھے رہ گئی تھی، اور لڑکی سے مخاطب ہو کر کہا "اس کو

تو شہادت کا رتبہ مل گیا۔"

لڑکی نے منہ دوسری طرف موڑ لیا۔

اخلاق تھوڑی دیر کے بعد پھر اس سے مخاطب ہوا: "آپ کو اعتراض ہے تو واپس چلا جاتا ہوں۔"

لڑکی نے اس کی طرف دیکھا مگر کوئی جواب نہ دیا۔

انار کلی کی ایک گلی میں تانگہ رکا اور وہ لڑکی اتر کر اخلاق کی طرف بار بار دیکھتی، نقاب اٹھا کر ایک مکان میں داخل ہو گئی۔ اخلاق ایک پاؤں سائیکل کے پیڈل پہ اور دوسرا پاؤں دوکان کے تھڑے پر رکھے تھوڑی دیر کھڑا رہا۔ سائیکل چلانے ہی والا تھا کہ اس مکان کی پہلی منزل پہ ایک کھڑکی کھلی۔ لڑکی نے جھانک کر اخلاق کو دیکھا۔ مگر فوراً ہی شرما کر پیچھے ہٹ گئی۔ اخلاق تقریباً آدھا گھنٹہ وہاں کھڑا رہا۔ مگر وہ پھر کھڑکی میں نمودار نہ ہوئی۔

دوسرے روز اخلاق صبح سویرے انار کلی کی اسی گلی میں پہنچا۔ پندرہ بیس منٹ تک ادھر ادھر ٹہلتا رہا۔ کھڑکی بند تھی مایوس ہو کر لوٹنے والا تھا کہ ایک فالسے بیچنے والا صدا لگاتا آیا۔ کھڑکی کھلی۔ لڑکی سر سے ننگی نمودار ہوئی۔ اس نے فالسے والے کو آواز دی۔

"بھائی فالسے والے ذرا ٹھہرنا۔" پھر اس کی نگاہیں ایک دم اخلاق پہ پڑیں۔ چونک کر وہ پیچھے ہٹ گئی۔ فالسے والے نے سر پہ سے چھبڑی اتاری اور بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ لڑکی سر پہ ڈوپٹہ لئے نیچے آئی۔ اخلاق کو اس نے

کنکھیوں سے دیکھا، شرمائی اور فالسے لئے بغیر واپس چلی گئی۔

اخلاق کو یہ ادا بہت پسند آئی۔ تھوڑا سا ترس بھی آیا۔ فالسے والے نے جب اس کو گھور کے دیکھا تو وہاں سے چل دیا۔ "چلو آج اتنا ہی کافی ہے۔"

چند دن ہی میں اخلاق اور اس لڑکی میں اشارے شروع ہو گئے۔ ہر روز صبح نو بجے وہ انارکلی کی اس گلی میں پہنچتا۔ کھڑکی کھلتی وہ سلام کرتا، وہ جواب دیتی مسکراتی، ہاتھ کے اشاروں سے کچھ باتیں ہوتیں، اس کے بعد چلی جاتی۔

ایک روز انگلیاں گھما کر اس نے اخلاق کو بتایا کہ وہ شام کے چھ بجے کے شو میں سنیما دیکھنے جا رہی ہے، اخلاق نے اشاروں کے ذریعے سے پوچھا "کون سے سنیما ہاؤس میں؟" اس نے جواب میں کچھ اشارے کئے، مگر اخلاق نہ سمجھا، آخر میں اس نے اشاروں میں کہا "کاغذ پر لکھ کر نیچے پھینک دو۔"

لڑکی کھڑکی سے ہٹ گئی، چند لمحات کے بعد اس نے ادھر اُدھر دیکھ کر کاغذ کی ایک مروڑی سی نیچے پھینک دی، اخلاق نے اسے کھولا، لکھا تھا "پلازہ" پروین۔

شام کو "پلازہ" میں اس کی ملاقات پروین سے ہوئی۔ اس کے ساتھ اس کی سہیلی تھی۔ اخلاق اس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ فلم شروع ہوا تو پروین نے نقاب اُٹھا لیا۔ اخلاق سارا وقت اس کو دیکھتا رہا، اس کا دل دھک دھک کرتا رہا۔ انٹرول سے کچھ پہلے اس نے آہستہ سے اپنا ہاتھ بڑھایا اور اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ کانپ اُٹھی، اخلاق نے فوراً ہاتھ اُٹھا لیا، دراصل وہ اس کو انگوٹھی دینا چاہتا تھا، بلکہ خود پہنانا چاہتا تھا، جو اس نے اسی روز خریدی تھی۔

انٹرول ختم ہوا۔ تو اس نے پھر اپنا ہاتھ بڑھایا اور اس کے ہاتھ پر رکھ دیا، وہ کانپی لیکن اخلاق نے ہاتھ نہ ہٹایا، تھوڑی دیر کے بعد اس نے انگوٹھی نکالی اور اس کی ایک انگلی میں چڑھا دی۔ وہ بالکل خاموش رہی اخلاق نے اس کی طرف دیکھا، پیشانی اور ناک پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے تھرتھرا رہے تھے۔

فلم ختم ہوا تو اخلاق اور پروین کی یہ ملاقات بھی ختم ہو گئی۔ باہر نکل کر کوئی بات نہ ہو سکی۔ دونوں سہیلیاں ٹانگے میں بیٹھیں۔ اخلاق کو دوست مل گئے انہوں نے اس کو روک لیا۔ لیکن وہ بہت خوش تھا اس لئے کہ پروین نے اس کا تحفہ قبول کر لیا تھا۔

دوسرے روز مقررہ اوقات پر جب اخلاق پروین کے گھر کے پاس پہنچا تو کھڑکی کھلی تھی، اخلاق نے سلام کیا، پروین نے جواب دیا، اس کے داہنے ہاتھ کی انگلی میں اس کی پہنائی ہوئی ہوئی انگوٹھی چمک رہی تھی۔

تھوڑی دیر اشارے ہوتے رہے اس کے بعد پروین نے ادھر ادھر دیکھ کر ایک لفافہ نیچے پھینک دیا۔ اخلاق نے اٹھایا، کھولا تو اس میں ایک خط تھا۔ انگوٹھی کے شکریہ کا۔

گھر پہنچ کر اخلاق نے ایک طویل جواب لکھا، اپنا دل نکال کر کاغذ پر رکھ دیا اس خط کو اس نے پھول دار لفافے میں بند کیا، اس پر سینٹ لگایا اور دوسرے روز صبح نو بجے پروین کو دکھا کر نیچے لیٹر بکس میں ڈال دیا۔

اب ان میں باقاعدہ خط و کتابت شروع ہو گئی۔ ہر خط عشق و محبت کا ایک دفتر تھا۔ ایک خط اخلاق نے اپنے خون سے لکھا۔ جس میں اس نے قسم کھائی کہ وہ

ہمیشہ اپنی محبت میں ثابت قدم رہے گا۔ اس کے جواب میں خونی تحریر ہی آئی۔ پروین نے بھی حلف اٹھایا کہ وہ مر جائے گی لیکن اخلاق کے سوا اور کسی کو شریک حیات نہیں بنائے گی۔

مہینوں گزر گئے اس دوران میں کبھی کبھی کسی سنیما میں دونوں کی ملاقات ہو جاتی تھی، مل کر بیٹھنے کا موقعہ نہیں ملتا تھا۔ پروین پر گھر کی طرف سے بہت کڑی پابندیاں عائد تھیں۔ وہ باہر نکلتی تھی یا تو اپنے بھائی کے ساتھ یا اپنی سہیلی زہرہ کے ساتھ ان دو کے علاوہ اس کو اور کسی کے ساتھ باہر جانے کی اجازت نہیں تھی۔ اخلاق نے اسے کئی مرتبہ لکھا کہ زہرہ کے ساتھ وہ کبھی اسے بارہ دری میں یا جہانگیر کے مقبرے میں ملے، مگر وہ نہ مانی۔ اس کو ڈر تھا کہ کوئی دیکھ لے گا۔

اس اثنا میں اخلاق کے والدین نے اس کی شادی کی بات چیت شروع کر دی۔ اخلاق ٹالتا رہا۔ جب انہوں نے تنگ آ کر ایک جگہ بات کر دی تو اخلاق بگڑ گیا۔ بہت ہنگامہ ہوا۔ یہاں تک کہ اخلاق کو گھر سے نکل کر ایک رات اسلامیہ کالج کی گراؤنڈ میں سونا پڑا۔ ادھر پروین روتی رہی کھانے کو ہاتھ تک نہ لگایا۔

اخلاق دھن کا بہت پکا تھا۔ ضد کا بھی پرلے درجے کا تھا، گھر سے باہر قدم نکالا تو پھر ادھر کا رخ تک نہ کیا، اس کے والد نے اس کو بہت سمجھایا بجھایا مگر وہ نہ مانا، ایک دفتر میں سو روپے ماہوار پر ملازمت کر لی اور ایک چھوٹا سا مکان کرایے پر لے کر رہنے لگا، جس میں نل تھا نہ بجلی۔

اُدھر پروین اخلاق کی تکلیفوں کے دکھ میں گھلی رہی تھی۔ گھر میں جب اچانک اس کی شادی کی بات چیت شروع ہوئی تو اس پر بجلی سی گری۔ اس نے اخلاق کو لکھا۔ وہ بہت پریشان ہوا، لیکن پروین کو اس نے تسلی دی کہ وہ گھبرائے نہیں، ثابت قدم رہے۔ عشق ان کا امتحان لے رہا ہے۔

بارہ دن گزر گئے۔ اخلاق کئی بار گیا مگر پروین کھڑکی میں نظر نہ آئی۔ وہ صبر و قرار کھو بیٹھا، نیند اس کی غائب ہو گئی، اس نے دفتر جانا چھوڑ دیا۔ زیادہ ناغے ہوئے تو اسکو ملازمت سے برطرف کر دیا گیا، اس کو کچھ ہوش نہیں تھا برطرفی کا نوٹس ملا تو وہ سیدھا پروین کے مکان کی طرف چل پڑا، پندرہ دنوں کے طویل عرصے کے بعد اسے پروین نظر آئی۔ وہ بھی ایک لحظہ کے لئے جلدی سے لفافہ پھینک کر وہ چلی گئی۔

خط بہت طویل تھا پروین کی غیر حاضری کا باعث یہ تھا کہ اس کا باپ اس کو اپنے ساتھ گوجرانوالہ لے گیا تھا، جہاں اس کی بڑی بہن رہتی تھی۔ پندرہ دن وہ خون کے آنسو روتی رہی، اس کا جہیز تیار کیا جا رہا تھا، لیکن اس کو محسوس ہوتا تھا کہ اس کے لئے رنگ برنگے کفن بن رہے ہیں۔ خط کے آخیر میں یہ لکھا تھا تاریخ مقرر ہو چکی ہے، میری موت کی تاریخ مقرر ہو چکی ہے، میں مر جاؤں گی، میں ضرور کچھ کھا کے مر جاؤں گی، اس کے سوا اور کوئی راستہ مجھے دکھائی نہیں دیتا۔ نہیں نہیں ایک اور راستہ بھی ہے، لیکن میں کیا اتنی ہمت کر سکوں گی، تم بھی اتنی ہمت کر سکو گے ... میں تمہارے پاس چلی آؤں گی۔ مجھے تمہارے پاس آنا ہی پڑے گا۔ تم نے میرے لئے گھر بار چھوڑا، میں تمہارے لئے یہ گھر نہیں چھوڑ سکتی، جہاں میری

موت کے سامان ہو رہے ہیں۔ لیکن میں بیوی بن کر تمہارے ساتھ رہنا چاہتی ہوں، تم شادی کا بندوبست کر لو میں صرف تین کپڑوں میں آؤں گی۔ زیور وغیرہ سب اتار کر یہاں پھینک دوں گی۔ جواب جلد دو، ہمیشہ تمہاری پروین۔

اخلاق نے کچھ نہ سوچا فوراً اس کو لکھا "میری بانہیں تمہیں اپنے آغوش میں لینے کے لئے تڑپ رہی ہیں، میں تمہاری عزت و عصمت پر کوئی حرف نہیں آنے دوں گا تم میری رفیق حیات بن کے رہو گی، زندگی بھر میں تمہیں خوش رکھوں گا۔"

ایک دو خط اور لکھے گئے اس کے بعد طے کیا گیا کہ پروین بدھ کو صبح سویرے گھر سے نکلے گی، اخلاق تانگہ لے کر گلی کے نکڑ پر اس کا انتظار کرے۔

بدھ کو منہ اندھیرے اخلاق تانگے میں وہاں پہنچ کر پروین کا انتظار کرنے لگا۔ پندرہ بیس منٹ گزر گئے۔ اخلاق کا اضطراب بڑھ گیا۔ لیکن وہ آ گئی، چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی، وہ گلی میں نمودار ہوئی چال میں لڑکھڑاہٹ تھی، جب وہ تانگے میں اخلاق کے ساتھ بیٹھی تو سر تا پا کانپ رہی تھی، اخلاق خود بھی کانپنے لگا

گھر پہنچے تو اخلاق نے بڑے پیار سے اس کے برقعے کی نقاب اٹھائی اور کہا "میری دلہن کب تک مجھ سے پردہ کرے گی۔"

پروین نے شرما کر آنکھیں جھکا لیں۔ اس کا رنگ زرد تھا جسم ابھی تک کانپ رہا تھا اخلاق نے بالائی ہونٹ کے تل کی طرف دیکھا۔ تو اس کے جسم میں ایک بوسہ تڑپنے لگا۔ اس کے چہرے کو اپنے ہاتھوں میں تھام کر اس نے تل والی جگہ کو چوما۔ پروین نے نہ نہ کی اس کے ہونٹ کھل گئے۔ دانتوں میں محو لذت خورد نہ تھا۔ مسوڑے گہرے نیلے رنگ کے تھے سر پڑے ہوئے، سر اندر کا ایک بھبکا اخلاق کی ناک میں گھس گیا۔ ایک مسوڑا خراب اس کو لگا ایک اور بھبکا پروین کے منہ سے نکلا تو

تو وہ ایک دم پیچھے ہٹ گیا۔

پروین نے حیا آلود آواز میں کہا "شادی سے پہلے آپ کو ایسی باتوں کا حق نہیں پہنچتا۔"

یہ کہتے ہوئے اس کے گلے ہوئے مسوڑھے نمایاں ہوئے اخلاق کے ہوش و حواس غائب تھے۔ دماغ سن ہو گیا تھا، دیر تک وہ دونوں پاس پاس بیٹھے رہے۔ اخلاق کو کوئی بات نہیں سوجھتی تھی، پروین کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں، جب اس نے انگلی کا ناخن کاٹنے کے لئے ہونٹ کھولے تو پھر ان گلے ہوئے مسوڑوں کی نمائش ہوئی، بو کا ایک بھبکا نکلا، اخلاق کو متلی آنے لگی، اٹھا اور "ابھی آیا" کہہ کر باہر نکل گیا۔ ایک تھڑے پر بیٹھ کر اس نے بہت دیر سوچا، جب کچھ سمجھ میں نہ آیا تو لائل پور روانہ ہو گیا، جہاں اس کا ایک دوست رہتا تھا، اخلاق نے سارا واقعہ سنایا تو اس نے بہت لعن طعن کی اور اس سے کہا "فوراً واپس جاؤ، کہیں بیچاری خودکشی نہ کر لے۔"

اخلاق رات کو واپس لاہور آیا، گھر میں داخل ہوا تو پروین موجود نہیں تھی پلنگ پر تکیہ پڑا تھا، اس پر دو گول گول نشان تھے، گیلے!

اس کے بعد اخلاق کو پروین کہیں نظر نہ آئی۔

۵ر جون ۱۹۵۵ء

کُتّے کی دُعا

"آپ یقین نہیں کریں گے، مگر یہ واقعہ جو میں آپ کو سُنانے والا ہوں، بالکل صحیح ہے۔" یہ کہہ کر شیخ صاحب نے بیڑی سلگائی، دو تین زور کے کش لے کر اسے پھینک دیا، اور اپنی داستان سنانا شروع کی۔ شیخ صاحب کے مزاج سے ہم واقف تھے اس لئے ہم خاموشی سے سنتے رہے، درمیان میں اُن کو کہیں بھی نہ ٹوکا۔

آپ نے واقعہ یوں بیان کرنا شروع کیا۔ گولڈی میرے پاس پندرہ برس سے تھا، جیسا کہ نام سے ظاہر ہے ..... اس کا رنگ سنہری مائل بھورا سا تھا بہت ہی حسین لگتا تھا۔ جب میں صبح اس کے ساتھ باغ کی سیر کو نکلتا تو لوگ اس کو دیکھنے کے لئے کھڑے ہو جاتے تھے، لارنس گارڈن کے باہر میں اسے کھڑا کر دیتا، "گولڈی کھڑے رہنا یہاں، میں ابھی آتا ہوں۔" یہ کہہ کر میں باغ

کے اندر چلا جاتا، گھوم پھر کر آدھے گھنٹے کے بعد واپس آتا تو گولڈی وہیں اپنے لمبے لمبے کان لٹکائے کھڑا ہوتا۔

اسپینل ذات کے کتے عام طور پر بڑے اطاعت گزار اور فرمانبردار ہوتے ہیں۔ مگر میرے گولڈی میں یہ صفات بہت نمایاں تھیں۔ جب تک اس کو اپنے ہاتھ سے کھانا نہ دوں، نہیں کھاتا تھا۔ دوست یاروں نے میرا مان توڑنے کے لئے لاکھوں جتن کئے۔ مگر گولڈی نے ان کے ہاتھ سے ایک دانہ تک نہ کھایا۔

ایک روز اتفاق کی بات ہے، میں لارنس کے باہر اسے چھوڑ کر اندر گیا تو ایک دوست مل گیا۔ گھومتے گھامتے کافی دیر ہو گئی۔ اس کے بعد وہ مجھے اپنی کوٹھی لے گیا۔ مجھے شطرنج کھیلنے کا مرض تھا، بازی شروع ہوئی تو میں دُنیا و مافیہا بھول گیا۔ کئی گھنٹے بیت گئے، دفعتاً مجھے گولڈی کا خیال آیا، بازی چھوڑ، لارنس کے گیٹ کی طرف بھاگا۔ گولڈی وہیں اپنے لمبے لمبے کان لٹکائے کھڑا تھا، مجھے اس نے عجیب نظروں سے دیکھا، جیسے کہہ رہا ہے "دوست، تم نے آج اچھا سلوک کیا مجھ سے۔"

میں بے حد نادم ہوا۔ چنانچہ آپ یقین جانیں میں نے شطرنج کھیلنا چھوڑ دی۔ معاف کیجئے گا، میں اصل واقعہ کی طرف ابھی تک نہیں آیا۔ دراصل گولڈی کی بات شروع ہوئی تو میں چاہتا ہوں کہ اس کے متعلق مجھے جتنی باتیں یاد ہیں آپ کو سنا دوں۔ مجھے اس سے بیحد محبت تھی، میرے مجرد رہنے کا ایک باعث اس کی محبت بھی تھی، جب میں نے شادی نہ کرنے کا

تہیہ کیا تو اس کو خصی کرا دیا۔ آپ شاید یہ کہیں کہ میں نے ظلم کیا، لیکن میں سمجھتا ہوں محبت میں ہر چیز روا ہے۔ میں اس کی ذات کے سوا اور کسی کو وابستہ دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔

کئی بار میں نے سوچا اگر میں مر گیا تو یہ کسی اور کے پاس چلا جائے گا کچھ دیر میری موت کا اثر اس پر رہے گا۔ اس کے بعد مجھے بھول کر اپنے آقا سے محبت کرنا شروع کر دے گا۔ جب میں یہ سوچتا تو مجھے بہت دکھ ہوتا۔ لیکن میں نے یہ تہیہ کر لیا تھا۔ کہ اگر مجھے اپنی موت کی آمد کا پورا یقین ہو گیا تو میں گولڈی کو ہلاک کر دوں گا۔ آنکھیں بند کر کے اُسے گولی کا نشانہ بنا دوں گا۔

گولڈی کبھی ایک لمحہ کے لئے مجھ سے جدا نہیں ہوا تھا۔ رات کو ہمیشہ میرے ساتھ سوتا۔ میری تنہا زندگی میں وہ ایک روشنی تھی۔ میری بے صد پھیکی زندگی میں اس کا وجود ایک شیرینی تھا۔ اس لیے میری غیر معمولی محبت دیکھ کر کئی دوست مذاق اُڑاتے تھے۔ "شیخ صاحب! گولڈی کتیا ہوتی تو آپ نے ضرور اس سے شادی کر لی ہوتی۔"

ایسے ہی کئی اور بھی فقرے کسے جاتے۔ لیکن میں مسکرا دیتا۔ گولڈی بڑا ذہین تھا۔ اس کے متعلق جب کوئی بات ہوتی تو فوراً اس کے کان کھڑے ہو جاتے تھے۔ میرے ہلکے سے ہلکے اشارے کو بھی وہ سمجھ لیتا تھا۔ میرے موڈ کے سارے اُتار چڑھاؤ اُسے معلوم ہوتے تھے۔ اگر کسی وجہ سے رنجیدہ ہوتا تو وہ میرے ساتھ چہلیں شروع کر دیتا مجھے خوش کرنے کے لئے ہر ممکن کوشش کرتا۔

ابھی اس نے ٹانگ اُٹھا کر پیشاب کرنا نہیں سیکھا تھا۔ یعنی ابھی کم سن تھا۔ کہ اس نے ایک برتن کو جو کہ خالی تھا۔ تھوتھنی بڑھا کر سونگھا۔ میں نے اُسے جھڑکا تو دُم دبا کر وہیں بیٹھ گیا۔ پہلے اس کے چہرے پر حیرت سی پیدا ہوئی تھی کہ ہیں یہ مجھ سے کیا ہو گیا۔ دیر تک گردن نیوڑھائے بیٹھا رہا۔ جیسے ندامت کے سمندر میں غرق ہے۔ میں اٹھا۔ اٹھ کر اس کو اپنی گود میں لیا۔ پیار پچکارا۔ بڑی دیر کے بعد جا کر اُس کی دُم ہلی۔ مجھے بہت ترس آیا کہ میں نے خواہ مخواہ اس کو ڈانٹا کیونکہ اس روز رات کو غریب نے کھانے کو منہ نہ لگایا۔ وہ بڑا احساس کُنا تھا۔

میں بہت بے پرواہ آدمی ہوں۔ میری غفلت سے اس کو ایک بار نمونیہ ہو گیا۔ میرے اوسان خطا ہو گئے۔ ڈاکٹروں کے پاس دوڑا۔ علاج شروع ہوا۔ مگر اثر ندارد۔ متواتر سات راتیں جاگتا رہا۔ اس کو بہت تکلیف تھی۔ سانس بڑی مشکل سے آتا تھا۔ جب سینے میں درد اٹھتا تو وہ میری طرف دیکھتا جیسے یہ کہہ رہا ہے "فکر کی کوئی بات نہیں۔ میں ٹھیک ہو جاؤں گا۔"

کئی بار میں نے محسوس کیا کہ صرف میرے آرام کی خاطر اس نے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ اس کی تکلیف کچھ کم ہے۔ وہ آنکھیں میچ لیتا تاکہ میں تھوڑی دیر آنکھ لگا لوں۔ آٹھویں روز خدا خدا کر کے اس کا بخار ہلکا ہوا اور آہستہ آہستہ اتر گیا۔ میں نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا تو مجھے ایک تھکی تھکی سی مسکراہٹ اس کی آنکھوں میں تیرتی نظر آئی۔

نمونیے کے ظالم حملے کے بعد دیر تک اس کو نقاہت رہی۔ لیکن طاقت ور دواؤں نے اسے ٹھیک ٹھاک کر دیا۔ ایک لمبی غیر حاضری کے بعد

لوگوں نے مجھے اس کے ساتھ دیکھا تو طرح طرح کے سوال کرنے شروع کئے۔
"عاشق و معشوق کہاں غائب تھے اتنے دنوں؟"
"آپس میں کہیں لڑائی تو نہیں ہو گئی تھی؟"
"کسی اور سے تو نظر نہیں لڑ گئی تھی گولڈی کی؟"
میں خاموش رہا۔ گولڈی یہ بات سنتا تو ایک نظر میری طرف دیکھ کر خاموش ہو جاتا۔ بھونکنے دو کتوں کو۔

وہ مثل مشہور ہے کہ ہم جنس باہم جنس پرواز۔ کبوتر با کبوتر باز با باز۔ لیکن گولڈی کو ہم اپنے ہم جنسوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس کی دنیا صرف میری ذات تھی۔ اس سے باہر وہ کبھی نکلتا ہی نہیں تھا۔

گولڈی میرے پاس نہیں تھا جب ایک دوست نے مجھے اخبار پڑھ کر سنایا۔ اس میں ایک واقعہ لکھا تھا۔ آپ سنئے بڑا دلچسپ ہے۔ امریکہ یا انگلستان مجھے یاد نہیں کہاں، ایک شخص کے پاس کتا تھا۔ معلوم نہیں کس ذات کا اس شخص کا آپریشن ہونا تھا۔ اس کو ہسپتال لے گئے تو کتا بھی ساتھ ہو لیا۔ اسٹریچر پر ڈال کر اس کو آپریشن روم میں لے جانے لگے تو کتے نے اندر جانا چاہا۔ مالک نے اس کو روکا اور کہا "باہر کھڑے رہو۔ میں ابھی آتا ہوں۔" کتا حکم سن کر باہر کھڑا ہو گیا۔ اندر مالک کا آپریشن ہوا جو ناکام ثابت ہوا اس کی لاش دوسرے دروازے سے باہر نکال دی گئی۔ کتا بارہ برس تک وہیں کھڑا اپنے مالک کا انتظار کرتا رہا۔ پیشاب، پاخانے کے لئے کچھ دیر وہاں سے ہٹتا۔ پھر وہیں کھڑا ہو جاتا۔ آخر ایک روز موٹر کی لپیٹ میں آ گیا

اور بُری طرح زخمی ہوا۔ مگر اس حالت میں بھی وہ خود کو گھسیٹتا ہوا وہاں پہنچا جہاں اس کے مالک نے اُسے انتظار کرنے کے لئے کہا تھا۔ آخری سانس اس نے اسی جگہ لیا۔ یہ بھی لکھا تھا۔ کہ ہسپتال والوں نے اُس کی لاش میں بھُس بھر کے اس کو وہیں رکھ دیا ہے جیسے وہ اب بھی اپنے آقا کے انتظار میں کھڑا ہے۔

میں نے یہ داستان سُنی تو مجھ پر کوئی خاص اثر نہ ہوا۔ اوّل تو مجھے اس کی صحت ہی کا یقین نہ آیا لیکن جب گولڈی میرے پاس آیا اور مجھے اس کی صفات کا علم ہوا تو بہت برسوں کے بعد میں نے یہ داستان اپنی دوستوں کو سنائی۔ سناتے وقت مجھ پر ایک رقت طاری ہو جاتی تھی، اور میں سوچنے لگتا تھا "میرے گولڈی سے بھی کوئی ایسا کارنامہ وابستہ ہونا چاہئے۔ گولڈی معمولی ہستی نہیں ہے"

گولڈی بہت متین اور سنجیدہ تھا۔ بچپن میں اس نے تھوڑی شرارتیں کیں۔ مگر جب اس نے دیکھا کہ مجھے پسند نہیں تو ان کو ترک کر دیا۔ آہستہ آہستہ سنجیدگی اختیار کر لی جو تادم مرگ قائم رہی۔

میں نے تادم مرگ کہا ہے تو میری آنکھوں میں آنسو آ گئے ہیں۔

شیخ صاحب رُک گئے ان کی آنکھیں نم آلود ہو گئی تھیں۔ ہم خاموش رہے تھوڑے عرصے کے بعد انہوں نے رومال نکال کر آنسو پونچھے اور کہنا شروع کیا۔

"یہ میری زیادتی ہے کہ میں زندہ ہوں۔۔۔ لیکن شاید اس لئے زندہ ہوں کہ انسان ہوں۔۔ مر جاتا تو شاید گولڈی کی توہین ہوتی۔۔۔ جب وہ مرا تو رو رو کر میرا بُرا حال تھا۔ لیکن وہ مرا نہیں تھا۔ میں نے اس کو مروا دیا تھا۔

اس لئے نہیں کہ مجھے اپنی موت کی آمد کا یقین ہو گیا تھا۔ وہ پاگل ہو گیا تھا۔ ایسا پاگل نہیں جیسا کہ عام پاگل بنے ہوتے ہیں۔ اس کے مرض کا کچھ پتہ ہی نہ چلتا تھا۔ اس کو سخت تکلیف تھی۔ جانکنی کا سا عالم اس پر طاری تھا۔ ڈاکٹروں نے کہا۔ اس کا واحد علاج یہی ہے کہ اس کو مروا دو۔ میں نے پہلے سوچا نہیں۔ لیکن وہ جس اذیت میں گرفتار تھا مجھ سے دیکھی نہیں جاتی تھی۔ میں مان گیا۔ وہ اُسے ایک کمرے میں لے گئے جہاں برقی جھٹکا پہنچا کر ہلاک کرنے والی مشین تھی۔ میں ابھی اپنے نحیف دماغ میں اچھی طرح کچھ سوچ بھی نہ سکا تھا کہ وہ اس کی لاش لے آئے۔ میرے گولڈی کی لاش۔ جب میں نے اسے اپنے بازوؤں میں اٹھایا تو میرے آنسو ٹپ ٹپ اس کے سنہرے بالوں پر گرنے لگے جو پہلے کبھی گرد آلود نہیں ہوتے تھے۔ ملانگے میں اسے گھر لایا۔ دیر تک اس کو دیکھا کیا۔ پندرہ سال کی رفاقت کی لاش میرے بستر پر پڑی تھی۔ قربانی کا جسم ٹوٹ گیا تھا۔ میں نے اس کو نہلایا۔ کفن پہنایا۔ بہت دیر تک سوچتا رہا کہ اب کیا کروں۔ زمین میں دفن کروں یا جلا دوں۔

زمین میں دفن کرتا تو اس کی موت کا ایک نشان رہ جاتا۔ یہ مجھے پسند نہیں تھا۔ معلوم نہیں کیوں، یہ بھی معلوم نہیں کہ میں نے کیوں اس کو غرق دریا کرنا چاہا۔ میں نے اس کے متعلق اب بھی کئی بار سوچا ہے مگر مجھے کوئی جواب نہیں ملا۔ خیر میں نے ایک نئی بوری میں اس کی کفنائی ہوئی لاش ڈالی۔ دھودھا کر بیٹے اس میں ڈالے اور دریا کی طرف روانہ ہو گیا۔

جب بیڑی دریا کے درمیان میں پہنچی اور میں نے بوری کی طرف دیکھا

تو گولڈی سے پندرہ برس کی رفاقت و محبت ایک بہت ہی تیز تلخی بن کر میرے حلق میں اٹک گئی۔ میں نے اب زیادہ دیر کرنا مناسب نہ سمجھا۔ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے بوری اٹھائی اور دریا میں پھینک دی۔ بہتے ہوئے پانی کی چادر پر کچھ بلبلے اٹھے اور ہوا میں حل ہو گئے۔

بیڑی واپس ساحل پر آئی۔ میں اُتر کر دیر تک اسے دیکھتا رہا۔ جہاں میں نے گولڈی کو غرق آب کیا تھا۔ شام کا دھندلکا چھایا ہوا تھا۔ پانی بڑی خاموشی سے بہہ رہا تھا۔ جیسے وہ گولڈی کو اپنی گود میں سلا رہا ہے۔"

یہ کہہ کر شیخ صاحب خاموش ہو گئے۔ چند لمحات کے بعد ہم میں سے ایک نے ان سے پوچھا "لیکن شیخ صاحب آپ تو خاص واقعہ سنانے والے تھے۔"

شیخ صاحب چونکے "اوہ۔ معاف کیجئے گا۔ میں اپنی رو میں بہا نے کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ واقعہ یہ تھا کہ۔ میں ابھی عرض کرتا ہوں۔ پندرہ برس ہو گئے تھے ہماری رفاقت کو۔ اس دوران میں کبھی بیمار نہیں ہوا تھا۔ میری صحت ماشاء اللہ بہت اچھی تھی، لیکن جس دن میں نے گولڈی کی پندرھویں سالگرہ منائی۔ اس کے دوسرے دن میں نے اعضا شکنی محسوس کی، شام کو یہ اعضا شکنی تیز بخار میں تبدیل ہو گئی۔ رات سخت بے چین رہا، گولڈی جاگتا رہا۔ ایک آنکھ بند کر کے دوسری آنکھ سے مجھے دیکھتا رہا۔ پلنگ پر سے اتر کر نیچے جاتا، پھر آ کر بیٹھ جاتا۔

زیادہ عمر ہو جانے کے باعث اس کی بینائی اور سماعت کمزور ہو گئی تھی لیکن ذرا سی آہٹ ہوتی تو وہ چونک پڑتا اور اپنی دھندلی آنکھوں سے میری

طرف دیکھتا اور جیسے یہ پوچھتا "یہ کیا ہو گیا ہے تمہیں"۔

اس کو حیرت تھی کہ میں اتنی دیر تک پلنگ پر کیوں پڑا ہوں، لیکن وہ جلد ہی سارا بات سمجھ گیا۔ جب مجھے بستر پر لیٹے کئی دن گذر گئے تو اس کے سال خوردہ چہرے پر افسردگی چھا گئی۔ میں اس کو اپنے ہاتھ سے کھلایا کرتا تھا۔ بیماری کے آغاز میں تو میں اس کو کھانا دیتا رہا۔ جب نقاہت بڑھ گئی تو میں نے ایک دوست سے کہا کہ وہ صبح شام گولڈی کو کھانا کھلانے آجایا کرے۔ وہ آتا رہا مگر گولڈی نے پلیٹ کی طرف منہ نہ کیا۔ میں نے بہت کہا۔ لیکن وہ نہ مانا۔ ایک مجھے اپنے مرض کی تکلیف تھی جو دور ہونے ہی میں نہیں آتا تھا۔ دوسرے مجھے گولڈی کی فکر تھی، جس نے کھانا پینا بالکل بند کر دیا تھا۔

اب اس نے پلنگ پر بیٹھنا۔ لیٹنا بھی چھوڑ دیا۔ سامنے دیوار کے پاس سارا دن اور سارا رات خاموش بیٹھا اپنی دھندلی آنکھوں سے مجھے دیکھتا رہتا۔ اس سے مجھے اور بھی دکھ ہوا۔ وہ کبھی ننگی زمین پر نہیں بیٹھا تھا۔ میں نے اس سے بہت کہا۔ لیکن وہ نہ مانا۔

وہ بہت زیادہ خاموش ہو گیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ غم و اندوہ میں غرق ہے کبھی کبھی اٹھ کر پلنگ کے پاس آتا۔ عجیب حسرت بھری نظروں سے میری طرف دیکھتا اور گردن جھکا کر واپس دیوار کے پاس چلا جاتا۔

ایک رات لیمپ کی روشنی میں میں نے دیکھا کہ گولڈی کی دھندلی

آنکھوں میں آنسو چمک رہے ہیں اس کے چہرے سے حزن و ملال برس رہا تھا۔ مجھے بہت دُکھ پہنچا۔ میں نے اسے ہاتھ کے اشارے سے بلایا۔ لمبے لمبے سنہرے کان ہلاتا وہ میرے پاس آیا۔ میں نے بڑے پیار سے کہا۔ "گولڈی میں اچھا ہو جاؤں گا۔ تم دعا مانگو۔ تمہاری دعا ضرور قبول ہو گی۔"

یہ سن کر اس نے بڑی اداس آنکھوں سے مجھے دیکھا۔ پھر سر اٹھا کر چھت کی طرف دیکھنے لگا۔ جیسے دعا مانگ رہا ہے۔ کچھ دیر وہ اس طرح کھڑا رہا۔ میرے جسم پر جھرجھری سی طاری ہو گئی۔ ایک عجیب و غریب تصویر میری آنکھوں کے سامنے تھی۔ گولڈی سچ مچ دعا مانگ رہا تھا۔ میں سچ عرض کرتا ہوں وہ سراپا دعا تھا۔ میں کہنا نہیں چاہتا۔ لیکن اس وقت میں نے محسوس کیا کہ اُس کی روح خدا کے حضور میں پہنچ کر گڑگڑا رہی ہے۔

میں چند ہی دنوں میں اچھا ہو گیا۔ لیکن گولڈی کی حالت غیر ہو گئی۔ جب تک میں بستر پر تھا۔ وہ آنکھیں بند کئے دیوار کے ساتھ خاموش بیٹھا رہا۔ میں چلنے پھرنے کے قابل ہوا تو میں نے اس کو کھلانے پلانے کی کوشش کی مگر بے سود۔ اُس کو اب کسی شے سے دلچسپی نہیں تھی۔ دعا مانگنے کے بعد جیسے اس کی ساری طاقت زائل ہو گئی تھی۔

میں اس سے کہتا، میری طرف دیکھو گولڈی۔ میں اچھا ہو گیا ہوں — خدا نے تمہاری دعا قبول کر لی ہے۔ لیکن وہ آنکھیں نہ کھولتا میں نے دو تین دفعہ ڈاکٹر بلایا اُس نے انجکشن لگانے پر کچھ نہ ہوا، ایک دن میں ڈاکٹر لے کر آیا تو اس کا دماغ چل چکا تھا۔

میں اٹھا کر اسے بڑے ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ اور اس کو برقی ضرب سے ہلاک کرا دیا۔

مجھے معلوم نہیں بابر اور ہمایوں والا قصہ کہاں تک صحیح ہے۔ لیکن یہ واقعہ حرف بہ حرف درست ہے۔

۶ر جون ۱۹۵۰ء

پری

کشمیری گیٹ دہلی کے ایک فلیٹ میں انور کی ملاقات پرویز سے ہوئی۔ وہ قطعاً متاثر نہ ہوا۔ پرویز نہایت ہی بے جان چیز تھی۔ انور نے جب اس کی طرف دیکھا اور اس کو آداب عرض کیا تو اس نے سوچا۔ یہ کیا ہے عورت ہے یا مولی۔

پرویز اتنی سفید تھی کہ ---- ---- اس کی سفیدی بے جان سی ہو گئی تھی۔ جس طرح مولی ٹھنڈی ہوتی ہے، اس طرح اس کا سفید رنگ بھی ٹھنڈا تھا۔ کمر میں ہلکا سا خم تھا۔ جیسا کہ اکثر مولیوں میں ہوتا ہے۔ انور نے جب اس کو دیکھا تو اس نے سبز ڈوپٹہ اوڑھ رکھا تھا۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ اس کو پرویز ہو بہو مولی نظر آئی جس کے ساتھ سبز پتے لگے ہوں۔

انور سے ہاتھ ملا کر پرویز اپنے ننھے سے کتے کو گود میں لے کر کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس کے سرخی لگے ہونٹوں پر، جو اس کے سفید ٹھنڈے چہرے پر ایک دہکتا ہوا انگارہ سا لگتے تھے ضعیف سی مسکراہٹ پیدا ہوئی۔ کتے کے بالوں میں اپنی لمبی لمبی انگلیوں سے کنگھی کرتے ہوئے اس نے دیوار کے ساتھ لٹکی ہوئی انور کے دوست جمیل کی تصویر کو دیکھتے ہوئے کہا "آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔"

انور کو اس کے ساتھ مل کر قطعاً خوشی نہیں ہوئی تھی۔ رنج بھی نہیں ہوا تھا۔ اگر وہ سوچتا تو یقینی طور پر اپنے صحیح ردِ عمل کا بیان نہ کر سکتا۔ دراصل پرویز سے مل کر وہ کوئی فیصلہ نہیں کر سکا تھا کہ وہ ایک لڑکی سے ملا ہے یا اس کی ملاقات کسی لڑکے سے ہوئی ہے۔ یا سردیوں میں کرکٹ کے میچ دیکھتے ہوئے اس نے ایک مولی خریدی ہے۔

انور نے اس کی طرف غور سے دیکھا۔ اس کی آنکھیں خوبصورت تھیں۔ بس ایک صرف یہی چیز تھی۔ جس کے متعلق تعریفی الفاظ میں کچھ کہا جا سکتا تھا۔ ان آنکھوں کے علاوہ پرویز کے جسم کے ہر حصہ پر نکتہ چینی ہو سکتی تھی۔ باہیں بہت پتلی تھیں۔ جو چھوٹی آستینوں والی قمیص میں سے بہت ہی بیکار انداز میں باہر کو نکلی ہوئی تھیں۔ اگر اس کے سر پر سبز ڈوپٹہ نہ ہوتا تو انور نے یقیناً اس کو فرمبڑ پر سمجھا ہوتا۔ جس کا رنگ عام طور پر اکتا دینے والا سفید ہوتا ہے۔

اس کے ہونٹوں پر جیتے جیتے لہو جیسی سرخی بہت کھل رہی تھی۔

برف کے ساتھ آگ کا کیا جوڑ؟ ۔ اس کی چھوٹی آستینوں والی قمیص سفید کمبرک کی تھی۔ پتلون سفید لٹھے کی تھی۔ سینڈل بھی سفید تھے۔ اس تمام سفید کپڑے پر اس کا سبز ڈوپٹہ انقلاب انگیز نہیں تھا مگر اس کے سرخی لگے ہونٹ ایک عجیب سا ہنگامہ خیز تضاد بن کر اس کے چہرے کے ساتھ چمٹے ہوئے تھے۔

صحن میں جب وہ چند قدم چل کر جمیل کی طرف اپنے ننھے سے کتے کو گھسیٹتی ہوئی بڑھی تھی تو انور نے محسوس کیا تھا کہ یہ عورت جو کہ آ رہی ہے عورت نہیں ہے۔ تلوار کی ہے۔ اس سے ہاتھ ملاتے وقت اُسے ایسا معلوم ہوا تھا۔ جیسے اس کا ہاتھ کسی لوہے نے پکڑ لیا ہے۔ مگر جب اس نے باتیں شروع کیں تو وہ ٹھنڈک کی گرفت جو اس کے ہاتھ کے ساتھ چمٹی ہوئی تھی کچھ گرم ہونے لگی۔

وہ آوارہ خیال تھی۔ اس کی باتیں سب کی سب بے جوڑ تھیں۔ موسم کا ذکر کرتے کرتے وہ اپنے درزی کی طرف لڑھک گئی۔ درزی کی بات ابھی ادھوری ہی تھی کہ اس کو اپنے کتے کی چھینکوں کا خیال آ گیا۔ کتے نے چھینکا تو اس نے اپنے خاوند کے متعلق یہ کہنا شروع کر دیا "وہ بالکل میرا خیال نہیں رکھتے"۔ دیکھئے ابھی تک دفتر سے نہیں آئے۔"

انور کے لئے پرویز اور اس کا خاوند دونوں ایک تھے۔ وہ پرویز کو جانتا تھا، نہ اس کے خاوند کو۔ گفتگو کے دوران میں صرف اس کو اس قدر معلوم ہوا کہ پرویز کا خاوند جمیل کا پڑوسی ہے اور ایکسپورٹ امپورٹ کا کام کرتا ہے۔ البتہ اس نے یہ ضرور محسوس کیا کہ پرویز گفتگو کے آغاز سے گفتگو کے اختتام تک اس کو ایسی نظروں سے دیکھتی تھی، جن میں جنسی بلاوا تھا۔ انور

کو حیرت تھی کہ ایک ٹھنڈی موی میں یہ بلا وا کیسے ہو سکتا ہے۔

وہ اٹھ کر جانے لگی تو اس نے گود سے اپنے ننھے کتے کو اتارا اور اس سے کہا۔ "چلو ٹینی چلیں" پھر مسز جمیل سے جیگر وولن کے بارے میں کچھ پوچھ کر اپنے سرخ ہونٹوں پر چھدری سی مسکراہٹ پیدا کر کے انور کی طرف ہاتھ بڑھا کر اس نے کہا "میرے ہزبنڈ سے مل کر آپ کو بہت خوشی ہوگی"

ایک بار پھر انور نے فرجڈیئر میں اپنا ہاتھ دیا اور سوچا "مجھے اس کے ہزبنڈ سے مل کر کیا خوشی ہوگی۔ جب کہ یہ خود اس سے ناخوش ہے — اس نے کہا تھا کہ وہ میرا بالکل خیال نہیں رکھتے"

دیر تک وہ جمیل اور اس کی بیوی سے باتیں کرتا رہا کہ شاید ان میں سے کوئی پرویز کے متعلق بات کرے گا۔ اور اس کو اس عورت کے بارے میں کچھ معلومات حاصل ہوں گی، جس کو اس نے ٹھنڈی موی سمجھا تھا۔ مگر کوئی ایسی بات نہ ہوئی جو پرویز کی شخصیت پر روشنی ڈالتی۔ جیگر وولن کا ذکر آیا تو مسز جمیل نے صرف اتنا کہا "پری کا ٹیسٹ رنگوں کے بارے میں بہت اچھا ہے"

"پرویز۔ پری" انور نے سوچا "کتنی غلط تخفیف ہے یہ خستہ سی ریوڑھ کی ہڈی والی عورت جس کا رنگ اکتا دینے والی حد تک سفید ہے اس کو پری کہا جائے، کیا یہ کوہ قاف کی تو ہیں نہیں؟"

جب پرویز کے متعلق اور کوئی بات نہ ہوئی تو انور نے جمیل سے رخصت چاہی "اچھا بھائی میں چلتا ہوں" پھر وہ مسز جمیل سے مخاطب ہوا۔

"بھابی آپ کی پری بڑی دلچسپ چیز ہے۔"

مسز جمیل مسکرائی "کیوں؟"

انور نے یونہی کہہ دیا تھا۔ مسز جمیل نے کیوں کہا تو اس کو کوئی جواب نہ سوجھا۔ تھوڑے سے توقف کے بعد وہ مسکرایا "کیا آپ کے نزدیک وہ دلچسپ نہیں؟ کون ہیں یہ محترمہ؟"

مسز جمیل نے کوئی جواب نہ دیا۔ جمیل نے اس کی طرف دیکھا تو اس نے نظریں جھکا لیں۔ جمیل مسکرا کر اٹھا اور انور کے کاندھے کو دبا کر اس نے گٹک کر کہا "چلو تمہیں بتاتا ہوں کون ہیں یہ محترمہ؟۔ بڑی واجب تعظیم ہستی ہیں۔"

"آپ کو تو بس کوئی موقع ملنا چاہیئے۔" مسز جمیل کے لہجے میں جھنجھلاہٹ تھی۔

جمیل ہنسا "کیا میں غلط کہتا ہوں کہ پری واجب تعظیم ہستی نہیں۔"

"میں نہیں جانتی۔" یہ کہہ کر مسز جمیل اٹھی اور اندر کمرے میں چلی گئی۔ جمیل نے پھر انور کا کندھا دبایا اور اس سے مسکراتے ہوئے کہا "بیٹھ جاؤ۔ تمہاری بھابی نے ہمیں پری کے متعلق باتیں کرنے کا موقع دیدیا ہے۔"

انور بیٹھ گیا۔ جمیل نے سگریٹ سلگایا اور اس سے پوچھا "تمہیں پری میں کیا دلچسپی نظر آئی؟"

انور نے کچھ دیر اپنے دماغ کو کریدا "دلچسپی؟۔ میں کچھ نہیں کہہ سکتا میرا خیال ہے اس کا غیر دلچسپ ہونا ہی دلچسپی کا باعث ہے۔"

جمیل نے چٹکی بجا کر سگریٹ کی راکھ جھاڑ دی "... لفظوں کا اُلٹ پھیر نہیں چلے گا۔ صاف صاف بتاؤ تمہیں اس میں کیا دلچسپی نظر آئی؟"

انور کو یہ جرح پسند نہ آئی "مجھے جو کچھ کہنا تھا میں نے کہہ دیا ہے"

جمیل ہنسا، پھر ایک دم سنجیدہ ہو کر اس نے سامنے کمرے کی طرف دیکھا اور دبی زبان میں کہا "بڑی خطرناک عورت ہے انور"

انور نے حیرت سے پوچھا "کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ محترمہ دو آدمیوں کا خون کر چکی ہے"

انور کی آنکھوں کے سامنے معاً پرویز کا سفید رنگ آ گیا۔ مسکرا کر کہنے لگا "اس کے باوجود لہو کی ایک چھینٹ بھی نہیں اس میں"

لیکن فوراً ہی اس کو معاملے کی سنگینی کا خیال آیا تو اس نے سنجیدہ ہو کر جمیل سے پوچھا "کیا کہا تم نے؟ ۔ دو آدمیوں کا خون؟"

انور نے چٹکی بجا کر سگریٹ کی راکھ جھاڑی "جی ہاں ۔ ایک کیپٹن تھا دوسرا سر بہاؤ الدین کا لڑکا"

"کون سر بہاؤ الدین؟"

"ہاں وہی ۔ جو ایگریکلچرل ڈیپارٹمنٹ میں خدا معلوم کیا تھے"

انور کو کچھ پتہ نہ چلا بہاؤ الدین کو چھوڑ کر اس نے جمیل سے پوچھا ۔

"کیسے خون ہوا ان دونوں کا؟"

"جیسے ہوا کرتا ہے ۔ کالج میں کیپٹن صاحب سے پرتی کا یارانہ تھا ۔ شادی کر کے جب وہ بمبئی گئی تو وہاں سر بہاؤ الدین کے لڑکے سے راہ و رسم پیدا ہو گئی

اتفاق سے ٹریننگ کے سلسلے میں کپتان صاحب وہاں پہنچے ۔۔ پرویز نے تعلقات قائم کرنا چاہے تو سر بہاؤالدین کے لڑکے کے آڑے آئے ایک پارٹی میں دونوں کی چخ ہوئی ۔ دوسرے روز کپتان صاحب نے پستول داغ دیا۔ رقیب وہیں ڈھیر ہو گئے ۔ پری کو بہت افسوس ہوا بہاؤالدین کے لڑکے کی موت کے غم میں اس نے کئی دن سوگ میں کاٹے جب کپتان صاحب کو پھانسی ہوئی تو لوگ کہتے ہیں اس کی آنکھوں نے ہزار ہا آنسو بہائے ۔ اس کے بعد ایک نوجوان پارسی اس کے دام محبت میں گرفتار ہو گیا۔ وصل کی رات جب اُسے پتہ چلا کہ اس کی محبوبہ شادی شدہ ہے تو اس نے اپنے باپ کی ڈسپنسری سے زہر لے کر کھا لیا۔"

انور نے کہا۔" یہ تو تین خون ہوئے ۔"

جمیل مسکرایا۔" نوجوان پارسی خوش قسمت تھا اس کے باپ نے اُسے عورت کے منہ سے بچا لیا۔"

"بڑی عجیب و غریب عورت ہے۔" یہ کہہ کر انور سوچنے لگا کہ پرویز جس میں کشش نام کو بھی نہیں کیسے ان ہنگاموں کا باعث ہوئی ۔ کپتان نے اس میں کیا دیکھا۔ سر بہاؤالدین کے لڑکے کو اس میں کیا چیز نظر آئی ؟۔۔۔ ۔۔ اور اس نوجوان پارسی نے اس ڈھیلی ڈھالی عورت میں کیا دلکشی دیکھی ؟ ۔

انور نے پرویز کو تصور میں ننگا کر کے دیکھا۔ ڈھیلی ڈھالی ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ جس پر سفید سفید گوشت منڈھا ہوا تھا، خون کے بغیر۔ کولہے دُبلے پتلے، لڑکے کے کولہوں جیسے تھے، ریڑھ کی ہڈی میں کوئی دم نہیں تھا

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اگر اس کے سر پہ ہاتھ رکھ کر کسی نے دبا دیا تو وہ دو نیم ہو جائے گی، بال کٹے ہوئے تھے جو ہائیڈروجن پر اوکسائیڈ کے استعمال سے اپنا قدرتی رنگ کھو چکے تھے۔ کیا تھا اس کے سراپا میں؟۔ ایک فقط اس کی آنکھیں غنیمت تھیں۔

انور نے سوچا صرف آنکھیں کون چاٹتا پھرتا ہے کوئی بات ہونی چاہئے۔ لیکن حیرت ہے کہ اس ٹھنڈی مولی نے اتنے بڑے ہنگامے پیدا کئے۔ مجھ سے تو جب اس نے ہاتھ ملایا تھا تو میں نے خیال کیا تھا کہ مجھے بابو دار ۔۔ بڑکاریں آنی شروع ہو جائیں گی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا لیکن کچھ نہ کچھ ہے ضرور اس پہ کی ہیں۔

جمیل نے اُسے بتلایا کہ راولپنڈی میں پرویز کے کالج کے رومانس مشہور ہیں اس زمانے میں اس کے بیک وقت تین تین چار چار لڑکوں سے رومان چلتے تھے چھ لڑکے اسی کے باعث کالج بدر ہوئے، ایک کو بیمار ہو کر سینے ٹوریم میں داخل ہونا پڑا۔

انور کی حیرت بڑھتی گئی۔ اس نے جمیل سے پوچھا "کون ہے اس کا خاوند اور خود کس کی لڑکی ہے؟"

جمیل نے جواب دیا "بہت بڑے باپ کی۔ کسی زمانے میں احمد آباد ہائی کورٹ کے چیف جسٹس تھے۔ آج کل ریٹائرڈ ہیں۔ خاوند اس کا ہندو ہے۔"

"ہندو؟"

"نہیں اب عیسائی ہو چکا ہے۔"

"کیا کرتا ہے؟"

"میرا خیال ہے کہ شروع میں اس کا ذکر آیا تھا۔ کہ اکسپورٹ امپورٹ کا کام کرتا ہے۔"

انور کو یاد آ گیا۔ "ہاں، ہاں، کچھ ایسی بات ہوئی تھی۔ شاید بھابی جان نے بتایا تھا۔"

جمیل اور انور تھوڑی دیر خاموش رہے۔ جمیل نے سگریٹ سلگایا اور ادھر اُدھر دیکھ کر کہ اس کی بیوی نہ سن رہی ہو، انور کا کندھا دبا کر سرگوشی میں کہا۔ "تم پری سے ضرور ملو۔ دیکھنا کیا ہوتا ہے؟"

انور نے خود سے پوچھا مگر جمیل سے کہا۔ "کیا ہوگا؟"

جمیل کے ہونٹوں پر ایک شریر سی مسکراہٹ پیدا ہوئی۔ "وہی ہوگا جو منظورِ خدا ہوگا۔" پھر اس نے آواز دبا کر کہا۔ "کل شام چائے وہیں پئیں گے اس کا خاوند رات کو آتا ہے۔"

یہ پیغام طے ہو گیا۔ پرویز کے متعلق اتنی باتیں سن کر اس کے دماغ میں کھلبلی سی ہو رہی تھی، وہ بار بار سوچتا تھا۔ "ملاقات پر کیا ہوگا۔ کوئی غیر معمولی چیز وقوع پذیر ہوگی۔ ہو سکتا ہے جمیل نے مذاق کیا ہو۔ ہو سکتا ہے جمیل نے جو کچھ بھی اس کے بارے میں کہا سرتاپا غلط ہو۔ لیکن پھر اسے خیال آتا۔ جمیل کو خواہ مخواہ جھوٹ کی کیا ضرورت تھی۔

دوسرے روز شام کو جمیل اور وہ دونوں پری کے ہاں گئے وہ غسلخانے میں نہا رہی تھی۔ نوکر نے ان کو بڑے کمرے میں بٹھا دیا۔ انور رونگ کی ورق گردانی کرنے لگا دفعتاً جمیل اٹھا۔ "میں سگریٹ بھول آیا۔ ابھی آتا ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔

انور "ووگ" میں چھپی ہوئی ایک تصویر دیکھ رہا تھا کہ اسے کمرے میں کسی اور کی موجودگی کا احساس ہوا۔ نظریں اٹھا کر اس نے دیکھا تو پرویز تھی۔ انور سٹپٹا گیا اس نے سفید پاجامہ پہنا ہوا تھا جو جا بجا گیلا تھا ململ کا کرتہ اُس کے پانی سے تر بدن کے ساتھ چپکا ہوا تھا۔ مسکرا کر اس نے انور سے کہا۔ "آپ بڑے انہماک سے تصویر دیکھ رہے تھے۔"

پرچہ چھوڑ کر انور اٹھا۔ اس نے کچھ کہنا چاہا۔ مگر پرویز اس کے پاس آ گئی۔ پرچہ اٹھا کر اس نے ایک ہاتھ سے اپنے کٹے ہوئے بالوں کو ایک طرف کیا۔ اور مسکرا کر کہا۔ "مجھے معلوم ہے کہ آپ آتے ہیں تو میں ایسے ہی چلی آتی۔" یہ کہہ کر اس نے اپنے ململ کے گیلے کرتے کو دیکھا۔ جس میں دو کالے دھبے صاف دکھائی دے رہے تھے۔ پھر اس نے انور کا ہاتھ پکڑا۔ "چلئے اندر چلیں۔"

انور منمنایا۔ "جمیل۔ جمیل بھی ساتھ تھا میرے۔ سگریٹ بھول آیا تھا۔ لینے گیا ہے۔"

پرویز نے انور کو کھینچا۔ "وہ آ جائے گا۔ چلئے۔"

انور کو جانا ہی پڑا۔ جس کمرے میں وہ داخل ہوئے اس میں کوئی کرسی نہیں تھی۔ دو اسپرنگ والے سالگوانی پلنگ تھے، ایک ڈریسنگ ٹیبل تھی اُس کے ساتھ ایک اسٹول پڑا تھا، پری اس اسٹول پر بیٹھ گئی اور ایک پلنگ کی طرف اشارہ کر کے انور سے کہا۔ "بیٹھئے۔"

انور ہچکچاتے ہوئے بیٹھ گیا۔ اس نے چاہا کہ جمیل آجائے کیونکہ اسے بے حد الجھن ہو رہی تھی۔ پرویز کے کہنے کرنے کے ساتھ چپٹے ہوئے دو کالے دھبے اس کو دو اندھی آنکھیں لگتے تھے جو اس کے سینے کو گھور گھور کر دیکھ رہی ہیں۔ انور نے اٹھ کر جانا چاہا۔ "میرا خیال ہے میں جمیل کو بلا لاؤں۔" مگر وہ اس کے ساتھ پلنگ پر بیٹھ گئی۔ ڈریسنگ ٹیبل پر رکھے ہوئے فریم کی طرف اشارہ کر کے اس نے انور سے کہا۔ "یہ میرے ہزبنڈ ہیں۔ بہت ظالم آدمی ہے جمیل صاحب۔"

انور مسکرایا۔ "آپ مذاق کرتی ہیں۔"

"جی نہیں۔ میرے اور اس کے مزاج میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اصل میں شادی سے پہلے مجھے دیکھ لینا چاہتے تھا کہ وہ سمجھتا ہے کہ نہیں۔ جس چیز کا مجھے شوق ہو اسے بالکل پسند نہیں ہوتی۔ آپ بتائیے۔" یہ کہتی ہوئی وہ لوٹ لگا کر پلنگ پر اور بھی لیٹ گئی۔ "اس طرح لیٹنے میں کیا ہرج ہے۔"

انور ایک کونے میں سرک گیا۔ اسے کوئی جواب نہ سوجھا۔ اس نے صرف اتنا سوچا اس کا درمیانی حصہ کتنا غیر نسوانی ہے۔

پرویز اوندھی لیٹی رہی۔ "آپ نے جواب نہیں دیا مجھے۔ بتائیے اس طرح لیٹنے میں کیا حرج ہے؟"

انور کا حلق سوکھنے لگا۔ "کوئی حرج نہیں۔"

"لیکن اس کو ناپسند ہے۔ خدا معلوم کیوں۔" یہ کہہ کر پرویز نے گردن ٹیڑھی کر کے انور کی طرف دیکھا۔ "آدمی اس طرح لیٹے تو معلوم ہوتا ہے

نیند رہا ہے۔ میں یوں لیٹوں تو اوپر بڑا تکیہ رکھ لیا کرتی ہوں۔ ذرا اٹھائیے نا وہ تکیہ اور میرے اوپر رکھ دیجئے۔"

انور کا حلق بالکل خشک ہو گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کیا کرے۔ اٹھنے لگا تو پرویز نے اپنی پتلی ٹانگ سے اُس کو روکا۔ "بیٹھ جائیے نا۔"

"جی میں جمیل....."

"وہ سکرائی "جمیل بے وقوف ہے ایک دن مجھ سے باتیں کر رہا تھا۔ میں نے اس سے کہا اپنے خاوند کے سوا میرا اور کسی سے وہ تعلق نہیں رہا جو ایک مرد اور عورت میں ہوتا ہے۔ تو وہ ہنسنے لگا۔ مجھے تو ویسے بھی اس تعلق سے نفرت ہے ـــــ ذرا تکیہ اٹھا کر رکھ دیجئے نا میرے اوپر۔"

انور اسی بہانے اٹھا۔ تکیہ دوسرے کونے میں پڑا تھا۔ اُسے اٹھایا اور پرویز کے درمیانی حصے پر جو کہ بہت ہی غیر نسوانی تھا رکھ دیا۔

پرویز مسکرائی "شکریہ۔ بیٹھئے اب باتیں کریں۔"

"جی نہیں۔ آپ تکیے سے باتیں کریں، میں چلا۔" یہ کہہ کر انور پسینہ پونچھتا باہر نکل گیا۔

۷ر جون ۱۹۵۰ء

خود فریب

ہم نیو پیرس اسٹور کے پرانتیو یٹ کمرے میں بیٹھے تھے۔ باہر ٹیلی فون کی گھنٹی بجی تو اس کا مالک غیاث اُٹھ کر دوڑا۔ میرے ساتھ مسعود بیٹھا تھا اس سے کچھ دور ہٹ کر جلیل دانتوں سے اپنی چھوٹی چھوٹی انگلیوں کے ناخن کاٹ رہا تھا۔ اس کے کان بڑے غور سے غیاث کی باتیں سن رہے تھے، وہ ٹیلی فون پر کسی سے کہہ رہا تھا:۔

"تم جھوٹ بولتی ہو۔۔۔ اچھا خیر آج دیکھ لیں گے۔۔۔ پھر کیا کہا۔ تمہارے لئے تو ہماری جان حاضر ہے۔۔۔ اچھا تو ٹھیک پانچ بجے۔۔۔ خدا حافظ۔۔۔ کیا کہا؟۔۔۔ بھئی کہہ تو دیا کہ تمہیں مل جائے گی۔"

جلیل نے میری طرف دیکھا "منٹو صاحب عیش کرتا ہے یہ غیاث!"

میں جواب میں مسکرا دیا۔

جلیل انگلیوں کے ناخن اب تیزی سے کاٹنے لگا۔ "کئی لڑکیوں کے ساتھ اس کا ٹانکا ملا ہوا ہے۔ میں تو سوچتا ہوں ایک اسٹور کھول لوں۔ لیڈیز اسٹور۔ خواہ مخواہ پریس کے چکر میں پڑا ہوں۔ عورت کا سایہ تک بھی وہاں نہیں آتا۔ سارا دن گڑگڑاہٹیں سنو۔ اُلو کے پٹھے قسم کے گاہکوں سے مغز ماری کرو۔ یہ زندگی ہے؟"

میں پھر مسکرا دیا اتنے میں غیاث آ گیا۔ جلیل نے زور سے اس کے چمڑے والے پر دھپا مارا اور کہا "سنائیے کون تھی یہ جس کے لئے تو اپنی جان حاضر کر رہا تھا۔"

غیاث بیٹھ گیا اور کہنے لگا "منٹو صاحب کے سامنے ایسی باتیں نہ کیا کرو۔"

جلیل نے اپنی عینک کے موٹے شیشوں میں سے گھور کر غیاث کی طرف دیکھا اور کہا "منٹو صاحب کو سب معلوم ہے۔ تم بتاؤ کون تھی؟"

غیاث نے اپنے نیلے شیشے والی عینک اتار کر اس کی کمانی ٹھیک کرنی شروع کی "ایک نئی ہے۔ پرسوں آئی تھی ٹیلی فون کرنے۔ کسی سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی۔ فون کر چکی تو میں نے اس سے کہا، جناب فیس ادا کیجئے۔ یہ سن کر مسکرانے لگی۔ پرس میں سے ہاتھ ڈال کر اس نے دس روپے کا نوٹ نکالا اور کہا "حاضر ہے"۔ میں نے کہا، "شکریہ۔ آپ کا مسکرا دینا ہی کافی ہے۔ بس دوستی ہو گئی۔ ایک گھنٹے تک یہاں بیٹھی رہی جاتے ہوئے

دس منٹ گزر گئے۔ مسعود بالکل خاموش بیٹھا غالباً اپنی بیکاری کے متعلق سوچ رہا تھا۔ اٹھا۔ بکواس ہے۔ محض خود فریبی ہے۔" یہ کہہ کر اس نے مجھے سلام کیا اور چلا گیا۔

غیاث اپنی باتوں سے بہت خوش تھا۔ مسعود جب یکلخت بولا تو اُس کا چہرہ کسی قدر مُرجھا گیا۔ جلیل تھوڑی دیر کے بعد غیاث سے مخاطب ہوا۔ "کیا مانگ رہی تھی؟"

غیاث چونکا۔ "کیا کہا؟"

جلیل نے پھر پوچھا۔ "کیا مانگ رہی تھی؟"

غیاث نے کچھ توقف کے بعد کہا۔ "میڈن فورم بریسلیٹ۔"

جلیل کی آنکھیں عینک کے موٹے شیشوں کے عقب سے چمکیں۔ "سائز کیا ہے؟"

غیاث نے جواب دیا۔ "تھری ٹو۔"

جلیل مجھ سے مخاطب ہوا۔ "منٹو صاحب یہ کیا بات ہے انگیا دیکھتے ہی میرے اندر ہیجان سا پیدا ہو جاتا ہے۔"

میں نے مسکرا کر اس سے کہا۔ "آپ کی قوتِ متخیلہ بہت تیز ہے۔"

جلیل کچھ نہ سمجھا اور وہ نہ سمجھنا چاہتا تھا۔ اس کے دماغ میں کھد بد ہو رہی تھی وہ اس لڑکی کے متعلق باتیں کرنا چاہتا تھا جس کے ساتھ غیاث نے ٹیلی فون پر باتیں کی تھیں۔ چنانچہ میرا جواب سن کر اس نے غیاث سے کہا۔ "یار ہم سے ملاؤ اُسے۔"

غیاث نے کمانی ٹھیک کر کے عینک لگائی۔ "کبھی یہاں آئے گی تو مل لینا۔"

"کچھ نہیں یار تم ہمیشہ یہی تحفہ دیتے رہتے ہو۔ پچھلے دنوں جب وہ یہاں آئی تھی۔ کیا نام تھا اس کا؟۔ جمیلہ۔ میں نے آگے بڑھ کر اس سے بات کرنی چاہی تو تم نے ہاتھ جوڑ کر مجھے منع کر دیا۔ میں اسے کھا تو نہ جاتا۔" یہ کہہ کر جلیل نے عینک کے موٹے شیشوں کے پیچھے اپنی آنکھیں سکوڑ لیں۔

جلیل اور غیاث دونوں میں بچپنا تھا۔ دونوں ہر وقت لڑکیوں کے متعلق سوچتے رہتے تھے، خوبصورت، موٹی، دبلی، بھدی لڑکیوں کے متعلق۔ تانگے میں بیٹھی ہوئی لڑکیوں کے متعلق۔ پیدل چلتی اور سائیکل سوار لڑکیوں کے متعلق۔ جلیل اس معاملے میں غیاث سے بازی لے گیا تھا۔ دفتر سے کسی ضروری کام پر موٹر میں نکلتا۔ راستے میں کوئی تانگے میں بیٹھی یا موٹر میں سوار لڑکی نظر آجاتی تو اس کے پیچھے اپنی موٹر لگا دیتا۔ یہ اس کا محبوب ترین شغل تھا۔ لیکن اس نے کبھی بدتمیزی نہ کی تھی۔ چھیڑ چھاڑ سے اسے ڈر لگتا تھا۔ جہاں تک گفتار کا تعلق ہے اسے غازی کہنا چاہیئے بڑے بڑے مضبوط قلعے سر کر چکا تھا۔

پرائیویٹ کمرے میں جب باہر اسٹور سے کوئی نسوانی آواز آتی تو غیاث اچھل پڑتا اور پردہ ہٹا کر ایک دم باہر نکل جاتا۔ مرد گاہکوں سے اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی ان سے اس کا ملازم نبٹتا تھا۔

دونوں اپنے کام میں ہوشیار تھے اسٹور کس طرح چلایا جاتا ہے اس کو کیونکر مقبول بنا دیا جاتا ہے، اس کا غیاث کو بڑا اچھا سلیقہ تھا اسی طرح جلیل کو پریس کے تمام شعبوں پر کامل عبور تھا لیکن فرصت

کے اوقات میں وہ صرف لڑکیوں کے متعلق سوچتے تھے۔ خیالی اور اصلی لڑکیوں کے متعلق۔

اسٹور میں کسی دن جب کوئی بھی لڑکی نہ آتی تو غیاث اداس ہو جاتا۔ یہ اداسی وہ جلیل سے ٹیلی فون پر ان لڑکیوں کے متعلق باتیں کر کے دور کرتا جو بقول اس کے جال میں پھنسی ہوتی تھیں۔ جلیل اسے اپنے معرکے سناتا دونوں کچھ دیر باتیں کرتے۔ اسٹور میں کوئی گاہک آتا یا ادھر پریس میں کسی کو جلیل کی ضرورت ہوتی تو یہ دلچسپ سلسلہ گفتگو منقطع ہو جاتا۔

اس لحاظ سے نیو پیرس اسٹور بڑی دلچسپ جگہ تھی۔ جلیل وہاں دو تین مرتبہ ضرور آتا۔ پریس سے کسی کام کے لئے نکلتا تو چند منٹوں ہی کے لئے۔ اسٹور سے باہر ہو جاتا۔ غیاث سے کسی لڑکی کے بارے میں چھیڑ چھاڑ کرتا اور انگلی میں موٹر کی چابی گھماتا چلا جاتا۔

جلیل کو غیاث سے یہ گلہ تھا کہ وہ اپنی "لڑکیوں" کے متعلق انتہائی رازداری سے کام لیتا ہے، ان کا نام تک نہیں بتاتا۔ چھپ چھپ کر ان سے ملتا ہے۔ ان کو تحفے تحائف دیتا ہے اور اکیلے اکیلے عیش کرتا ہے۔ یہی گلہ غیاث کو جلیل سے تھا۔ لیکن دونوں کے دوستانہ تعلقات ویسے کے ویسے قائم تھے۔

ایک روز اسٹور میں ایک سیاہ برقعے والی عورت آئی۔ نقاب اٹھا ہوا تھا۔ چہرہ پسینہ سے شرابور تھا آتے ہی اسٹول پر بیٹھ گئی۔ غیاث جب اس کی طرف بڑھا تو اس نے برقعے سے پسینہ پونچھ کر اس سے کہا: "پانی پلائیے

ایک گلاس ۔

غیاث نے فوراً نوکر کو بھیجا کہ ایک ٹھنڈا لیمن لے آئے ۔ عورت نے چھت کے ساکن پنکھوں کو دیکھا اور غیاث سے پوچھا ۔ "پنکھا کیوں نہیں چلاتے آپ ؟"

غیاث نے سر تاپا معذرت بن کے کہا ۔ "دونوں خراب ہو گئے ہیں ۔ معلوم نہیں کیا ہوا ۔ میں نے آدمی بھیجا ہوا ہے ۔"

عورت اسٹول پر سے اٹھی ۔ "میں تو یہاں ایک منٹ نہیں بیٹھ سکتی ۔" یہ کہہ کر وہ شوکیسوں کو دیکھنے لگی ۔ "آدمی خاک شو پنگ کر سکتا ہے اس دوزخ میں ۔"

غیاث نے اٹک اٹک کر کہا ۔ "مجھے افسوس ہے ۔ آپ ۔ آپ اندر تشریف لے چلئے ..... جس چیز کی آپ کو ضرورت ہو گی میں لا کر دوں گا ۔"

عورت نے غیاث کی طرف دیکھا ۔ "چلئے ۔"

غیاث تیز قدمی سے آگے بڑھا ۔ پردہ ہٹایا اور اس عورت سے کہا ۔ "تشریف لائیے ۔"

عورت اندر کمرے میں داخل ہو گئی اور ایک کرسی پر بیٹھ گئی ۔ غیاث نے پردہ چھوڑ دیا ۔ وہ دونوں میری نظروں سے اوجھل ہو گئے ۔ چند لمحات کے بعد غیاث نکلا ۔ میرے پاس آ کر اس نے ہولے سے کہا ۔ "منٹو صاحب کیا خیال ہے آپ کا اس لڑکی کے بارے میں ؟"

میں مسکرا دیا ۔

غیاث نے ایک خانے سے مختلف اقسام کی لپ اسٹکیں نکالیں اور اندر کمرے میں لے گیا۔ اتنے میں جلیل کی موٹر کا ہارن بجا اور وہ انگلی پر چابی گھماتا نمودار ہوا۔ آتے ہی اس نے پکارا "غیاث۔ غیاث، آؤ بھئی سنو وہ کل والا معاملہ میں نے سب ٹھیک کر دیا ہے۔" پھر اس نے میری طرف دیکھا۔ "آداب منٹو صاحب۔ آداب عرض۔ غیاث کہاں ہے؟"

میں نے جواب دیا۔ "اندر کمرے میں۔"

"وہ میں نے سب ٹھیک کر دیا منٹو صاحب۔ ابھی ابھی پٹرول پمپ کے پاس ملی۔ پیدل جا رہی تھی۔ میں نے موٹر روکی اور کہا جناب یہ موٹر آخر کس مرض کی دوا ہے، اسے مرتنگ چھوڑ کر آ رہا ہوں۔" پھر اس نے کمرے کے پردے کی طرف منہ کر کے آواز دی۔ "غیاث باہر نکل بے!"

جلیل نے انگلی پر زور سے چابی گھمائی۔ "مصروف ہے۔ اب اس نے اندر مصروف ہونا شروع کر دیا ہے۔" کہہ کر اس نے آگے بڑھ کر پردہ اٹھایا، ایک دم اس کے جیسے بریک سی لگ گئی، پردہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور وہ بولا "کہہ کر وہ الٹے قدم واپس آیا اور گھبرائے ہوئے لہجے میں اس نے مجھ سے پوچھا۔ "منٹو صاحب، کون ہے؟"

میں نے دریافت کیا "کہاں کون؟"

"یہ جو اندر بیٹھی ہونٹوں پر لپ اسٹک لگا رہی ہے۔"

میں نے جواب دیا۔ "معلوم نہیں گاہک ہے۔"

جلیل نے عینک کے موٹے شیشوں کے پیچھے آنکھیں سکیڑیں اور

پردے کی طرف دیکھنے لگا۔ غیاث باہر نکلا جلیل سے "ہلو جلیل" کہا اور آئینہ اٹھا کر واپس کمرے میں چلا گیا۔ دونوں دفعہ جب پردہ اٹھا تو جلیل کو عورت کی ہلکی سی جھلک نظر آئی۔ میری طرف مڑ کر اس نے کہا "عیش کرتا ہے پٹھا۔" پھر اضطراب کی حالت میں ادھر ادھر ٹہلنے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد پردہ اٹھا۔ عورت ہونٹوں کو چوستی ہوئی نکلی۔ جلیل کی نگاہوں نے اس کو اسٹور کے باہر تک پہنچایا۔ پھر اس نے پلٹ کر کمرے کا رخ کیا۔ غیاث باہر نکلا رومال سے ہونٹ صاف کرتا۔ دونوں ایک دوسرے سے قریب قریب ٹکرا گئے۔ جلیل نے تیز لہجے میں اس سے پوچھا "یہ کیا قصہ تھا بھئی۔"

غیاث مسکرایا "کچھ نہیں۔" یہ کہہ کر اس نے رومال سے ہونٹ صاف کئے۔

جلیل نے غیاث کے چٹکی بھری "کون تھی۔"

"یار تم ایسی باتیں نہ پوچھا کرو۔" غیاث نے اپنا رومال ہوا میں لہرایا۔

جلیل نے چھین لیا۔ غیاث نے جھپٹا مار کر واپس لینا چاہا۔

جلیل پینترہ بدل کر ایک طرف ہٹ گیا۔ رومال کھول کر اس نے غور سے دیکھا جگہ جگہ سرخ نشان تھے عینک کے موٹے شیشوں کے پیچھے اپنی آنکھیں سکیڑ کر اس نے غیاث کو گھورا "یہ بات ہے۔"

غیاث ایسا چور بن گیا۔ جس کو کسی نے چوری کرتے پکڑ لیا ہے۔

"جانے دو یار۔ ادھر لاؤ رومال۔"

جلیل نے رومال واپس کر دیا "بتاؤ تو سہی کون تھی۔"

اتنے میں نوکر کھانا لے کر آ گیا۔ غیاث نے اس کو اتنی دیر لگانے پر جھڑکا۔

"کوئی مہمان آئے تو تم ہمیشہ ایسا ہی کیا کرتے ہو؟"

غیاث نے جلیل سے پوچھا "یہ لیمن اسی کے لئے منگوایا گیا تھا؟"

"ہاں یار۔ اتنی دیر میں آیا ہے کم بخت۔ دل میں کہتی ہوگی پیاسا ہی بھیج دیا۔" غیاث نے رومال جیب میں رکھ لیا۔

جلیل نے شوکیس پر سے لیمن کا گلاس اٹھایا اور غٹا غٹ پی گیا۔ "ہماری پیاس تو بجھ گئی۔ لیکن یار بتاؤ نا تھی کون؟ پہلی ہی ملاقات میں تم نے ہاتھ صاف کر دیا۔"

غیاث نے رومال نکال کر اپنے ہونٹ صاف کئے اور آنکھیں چمکا کر کہا۔ "چمٹ ہی گئی۔ میں نے کہا دیکھو ٹھیک نہیں۔ دوکان ہے۔ زبردستی میرے ہونٹوں کا چمّا لے گئی۔"

ایک دم مسعود کی آواز آئی "سب بکواس ہے۔ محض خود فریبی ہے۔"

غیاث چونک پڑا۔ مسعود اسٹور کے باہر کھڑا تھا اس نے مجھے سلام کیا اور چل دیا۔ جلیل فوراً ہی غیاث سے مخاطب ہوا "چھوڑو یار تم بتاؤ پھر کیا ہوا؟ یار چیز اچھی تھی۔ کیا نام ہے؟"

غیاث نے جواب نہ دیا مسعود کی آواز کے اچانک حملے سے وہ بوکھلا سا گیا تھا۔ جلیل کو ایک دم یاد آ گیا کہ وہ تو ایک بہت ہی ضروری کام پر نکلا ہے۔ انگلی پر چابی گھما کر اس نے غیاث سے کہا "لڑکی کے متعلق پھر پوچھوں گا۔ اچھا منٹو صاحب السلام علیکم۔" اور چلا گیا۔

میں نے مسکرا کر غیاث سے پوچھا "غیاث صاحب اتنی جلدی پہلی ہی

ملاقات میں آپ نے ....."

غیاث جھینپ گیا۔ میری بات کاٹ کر اس نے کہا "چھوڑیئے منٹو صاحب ۔ آپ ہمارے بزرگ ہیں۔ چلئے اندر بیٹھیں۔ یہاں گرمی ہے۔"

ہم اندر کمرے کی طرف چلنے لگے تو اسٹور کے باہر جلیل کی موٹر کی اس نے زور زور سے ہارن بجایا۔ غیاث نہ گیا تو وہ خود دوڑا اندر آیا "غیاث ادھر آؤ ۔ بس اسٹینڈ کے پاس ایک بڑی خوبصورت لڑکی کھڑی ہے۔"

غیاث اس کے ساتھ چلا گیا۔ میں مسکرانے لگا۔

اس دوران میں جلیل نے بڑی مشکلوں سے اپنے باپ کو راضی کر کے ایک کم سن لڑکی ملازم رکھ لی۔ اس کو وہ اپنی اسٹینو کہتا تھا۔ کئی بار موٹر میں اس کو اپنے ساتھ لایا۔ لیکن اس کو موٹر ہی میں بٹھائے رکھا۔ غیاث کو اس بات کا بہت غصہ تھا۔ ایک بار اسٹینو کے سامنے غیاث نے جلیل کا مذاق کیا تو وہ بہت سٹ پٹایا۔ اس کے کان کی لوئیں سرخ ہو گئیں۔ نظریں جھکا کر اس نے گاڑی اسٹارٹ کی اور یہ جا وہ جا۔

بقول جلیل کے یہ اسٹینو شروع شروع میں تو بڑی رنجیدہ رہی۔ لیکن آخر اس سے کھل ہی گئی "بس اب چند دنوں ہی میں معاملہ پٹا سمجھو۔"

غیاث اب زیادہ تر جلیل سے اسٹینو کی باتیں کرتا۔ جلیل اس سے اس لڑکی کے متعلق پوچھتا جس نے چمٹ کر اس کو چوم لیا تھا تو غیاث عموماً یہ کہتا "کل اس کا ٹیلی فون آیا۔ پوچھنے لگی آؤں؟ ۔ میں نے کہا یہاں نہیں۔ تم وقت نکالو تو میں کسی اور جگہ کا انتظام کر لوں گا۔"

جلیل اس سے پوچھتا "کیا کہا اس نے؟"

غیاث جواب دیتا "تم اپنی اسٹینو کی سناؤ"

اسٹینو کی باتیں شروع ہو جاتیں۔

ایک دن میں اور غیاث دونوں جلیل کے پریس گئے۔ مجھے اپنی کتاب کے گرد و پوش کے ڈیزائن کے بارے میں دریافت کرنا تھا۔ دفتر میں اسٹینو ایک کونے میں بیٹھی تھی۔ لیکن جلیل نہیں تھا۔ اسٹینو سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ وہ ابھی ابھی باہر نکلا ہے۔ میں نے نوکر کو بھیجا کہ اس کو ہماری آمد کی اطلاع دے، تھوڑی ہی دیر کے بعد جلیل آ گیا۔ چک اٹھا کر اس نے مجھے سلام کیا؛ اور غیاث سے کہا "ادھر آؤ غیاث"

ہم دونوں باہر نکلے۔ غیاث کو ایک کونے میں لیجا کر جلیل نے اُچھل کر غیاث سے کہا "میدان مار لیا۔ ابھی ابھی تمہارے آنے سے تھوڑی دیر پہلے" یہ کہہ کر وہ رک گیا اور مجھ سے مخاطب ہوا "معاف کیجئے گا منٹو صاحب" پھر اس نے غیاث کو زور سے اپنے ساتھ بھینچ لیا "بس میں نے آج اس کو پکڑ لیا۔ بالکل اس طرح۔ اور اسی جگہ۔ اس ٹریڈل کے پاس"

غیاث نے پوچھا "کیسے؟"

جلیل جھنجھلا گیا "ابے اپنی اسٹینو کو۔ قسم خدا کی مزا آ گیا۔ یہ دیکھو" اس نے اپنا رومال پتلون کی جیب سے نکال کر ہوا میں لہرایا۔ اس پر سرخی کے دھبے تھے۔

ایکا دم مسعود کی آواز آئی "بکواس ہے۔ محض خود فریبی ہے"

جلیل اور غیاث چونک اُٹھے۔ میں مسکرایا۔ ٹریڈمل کے توے پر سرخ رنگ کی پتلی سی ہموار تہہ پھیلی ہوئی تھی۔ ایک جگہ پونچھنے کے باعث کچھ خراشیں پڑ گئی تھیں۔

۸ جون ۱۹۵۰ء

برمی لڑکی

گھیان کی شوٹنگ تھی۔ اس لئے کفایت جلدی سو گیا۔ فلیٹ میں اور کوئی نہیں تھا۔ بیوی بچے راولپنڈی چلے گئے تھے۔ ہمسایوں سے اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ یوں بھی بمبئی میں لوگوں کو اپنے ہمسایوں سے کوئی سروکار نہیں ہوتا کفایت نے اکیلے برانڈی کے چار پگ پئے کھانا کھایا نوکروں کو رخصت کیا۔ اور دروازہ بند کر کے سو گیا۔

رات کے پانچ بجے کے قریب کفایت کے خمار آلود کانوں کو دھمک کی آواز سنائی دی۔ اس نے آنکھیں کھولیں۔ نیچے بازار میں ایک ٹرین دندناتی ہوئی گزری۔ چند لمحات کے بعد دروازے پر بڑے زوروں کی دستک ہوئی۔ کفایت اٹھا۔ پلنگ سے اترا تو اس کے ننگے پیر ٹخنوں تک

پانی میں چلے گئے۔ اس کو سخت حیرت ہوئی کہ کمرے میں اتنا پانی کہاں سے آیا۔ اور باہر کوری دوڑ میں اس سے بھی زیادہ پانی تھا۔ دروازے پر دستک جاری تھی۔ اس نے پانی کے متعلق سوچنا چھوڑا اور دروازہ کھولا۔

گیان نے زور سے کہا "یہ کیا ہے؟"

کفایت نے جواب دیا "پانی"

"پانی نہیں — عورت!" یہ کہہ گیان نیم اندھیرے کوری دوڑ میں داخل ہوا اس کے پیچھے ایک چھوٹے سے قد کی لڑکی تھی۔

گیان کو فرش پر پھیلے ہوئے پانی کا کچھ احساس نہ ہوا لڑکی نے پائجامہ اوپر اُٹھا لیا اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی گیان کے پیچھے چلی گئی۔

کفایت کے ذہن میں پہلے پانی تھا۔ اب یہ لڑکی اس میں داخل ہو گئی اور ڈبکیاں لگانے لگی۔ سب سے پہلے اس نے سوچا یہ کون ہے۔ شکل و صورت اور لباس کے اعتبار سے بری معلوم ہوتی ہے۔ لیکن گیان اُسے کہاں سے لے آیا۔

گیان اندر کمرے میں جا کر کپڑے تبدیل کئے بغیر پلنگ پر لیٹا اور لیٹتے ہی سو گیا۔ کفایت نے اس سے بات کرنی چاہی مگر اس نے صرف ہوں ہاں میں جواب دیا اور آنکھیں نہ کھولیں۔ کفایت نے اس لڑکی کی طرف ایک نظر دیکھا جو سامنے والے پلنگ پر بیٹھی تھی اور باہر نکل گیا۔

باورچی خانے میں جا کر اسے معلوم ہوا کہ ربڑ کا وہ پائپ جو رات کو

بڑا ڈرم بھرا کرتا تھا۔ باہر نکلا ہوا ہے، تین بجے جب نل میں پانی آیا تو اس نے تمام کمرے سیراب کر دیئے۔ تینوں نوکر باہر گلی میں سو رہے تھے۔ کفایت نے ان کو جگایا اور پانی خارج کرنے کے کام پر لگا دیا۔ وہ خود بھی ان کے ساتھ شریک تھا۔ سب مٹکوں سے پانی اٹھاتے تھے اور بالٹیوں میں ڈالتے جاتے تھے۔ اس برمی لڑکی نے جب اُن کو یہ کام کرتے دیکھا تو جھٹ پٹ سینڈل اُتار ان کا ہاتھ بٹانے لگی۔

اس کے چھوٹے گورے ہاتھ۔ انگلیوں کے ناخن بڑھائے ہوئے اور سرخی لگے نہیں تھے۔ چھوٹے چھوٹے کٹے ہوئے بال تھے۔ جن میں ہلکی ہلکی لہریں تھیں۔ مردار موضع کا مگر کھلا ریشمی پاجامہ پہنے تھی اس پر سیاہ رنگ کا ریشمی کرتا تھا جس میں اس کی چھوٹی چھوٹی ٹھیاں چھپی ہوئی تھیں۔

جب اس نے ان لوگوں کا ہاتھ بٹانا شروع کیا تو کفایت نے اسے منع کیا۔ "آپ تکلیف نہ کیجئے یہ کام ہو جائے گا۔"

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ چھوٹے چھوٹے سرخی لگے ہونٹوں سے مسکراتی اور کام میں لگی رہی۔ آدھے گھنٹے کے اندر اندر تینوں کمروں سے پانی نکل گیا۔ کفایت نے سوچا "چلو یہ بھی اچھا ہوا۔ اسی بہانے سارا گھر دھل کر صاف ہو گیا۔"

وہ برمی لڑکی ہاتھ دھونے کے لئے غسل خانے میں چلی گئی۔ کفایت کمر سیدھی کرنے کے لئے بستر پر لیٹا نیند ـــــ پوری نہیں ہوئی تھی سو گیا۔ تقریباً نو بجے وہ جاگا اور جاگتے ہی اسے سب سے پہلے پانی کا خیال آیا

پھر اس نے بڑی لڑکی کے متعلق سوچا، جو گیان کے ساتھ آئی تھی۔ "کہیں خواب تو نہیں تھا۔ لیکن یہ سامنے گیان سو رہا ہے اور فرش بھی دُھلا ہوا ہے۔"

کفایت نے غور سے گیان کی طرف دیکھا۔ وہ پتلون کوٹ بلکہ جوتے سمیت اوندھا سو رہا تھا۔ کفایت نے اس کو جگایا۔ اس نے ایک آنکھ کھولی اور پوچھا "کیا ہے؟"

یہ لڑکی کون ہے؟"

گیان ایک دم چونکا "لڑکی۔ کہاں ہے؟" پھر فوراً ہی چت لیٹ گیا۔ "اوہ۔ بکواس نہ کرو۔ ٹھیک ہے۔"

کفایت نے اسے پھر جگانے کی کوشش کی، مگر وہ خاموش سویا رہا۔ اس کو ساڑھے نو بجے اپنے کام پر جانا تھا۔ اُس نے جلدی جلدی غسل کیا۔ شیو بھی غسل خانے کے اندر ہی کر لیا۔ باہر نکل کر ڈرائنگ روم میں گیا۔ تو اس کو میز سجی ہوئی نظر آئی۔

صبح ناشتہ پر عام طور پر کفایت کے ہاں بہت ہی مختصر چیزیں ہوتی تھیں۔ دو اُبلے ہوئے انڈے۔ دو توس، مکھن اور چائے۔ مگر آج میز رنگین تھی اس نے غور سے دیکھا چھلے ہوئے انڈے، عجیب و غریب انداز میں کٹے ہوئے تھے کہ پھول معلوم ہوتے تھے۔ سلاد تھا۔ بڑے خوبصورت طریقے سے پلیٹ میں سجا ہوا۔ توسوں پر بھی مینا کاری کی ہوئی تھی۔ کفایت چکرا گیا۔ باورچی خانے میں گیا تو وہ بڑی لڑکی چوکی پر بیٹھی سامنے انگیٹھی رکھے کچھ کہہ رہی تھی تینوں نوکر اس کے ارد گرد تھے اور ہنس ہنس کر اس سے باتیں کر رہے تھے۔

کفایت کو دیکھ کر وہ اُٹھ کھڑے ہوئے، برمی لڑکی نے آنکھیں گھما کر اُس کی طرف دیکھا اور مسکرا دی۔

کفایت نے اس سے بات کرنا چاہی لیکن وہ کیسے کرتا۔ اس سے کیا کہتا وہ اس کو جانتا تک نہیں تھا۔ اس نے اپنے ایک نوکر سے صرف اتنا پوچھا۔

"یہ ناشتہ آج کس نے تیار کیا ہے بشیر؟"

بشیر نے اس برمی لڑکی کی طرف اشارہ کیا۔ "بائی جی نے۔"

وقت بہت کم تھا۔ کفایت نے جلدی جلدی ان کا سجیلا ناشتہ کھایا اور کپڑے پہن کر اپنے دفتر روانہ ہو گیا۔ شام کو واپس آیا تو وہ برمی لڑکی اس کے سلیپنگ سوٹ کا اکلوتا پاجامہ پہنے اپنا کرتہ استری کر رہی تھی۔ کفایت پیچھے ہٹ گیا۔ کیونکہ وہ صرف پاجامہ پہنے تھی۔

"آجائیے؟"

لہجہ بڑا صاف ستھرا تھا۔ کفایت نے سوچا کہ برمی لڑکی کی بجائے شاید کوئی اور بولا ہے۔ جب وہ اندر آ گیا تو اس لڑکی نے چھوٹے چھوٹے ہونٹوں پر مسکراہٹ پیدا کر کے اس کو سلام کیا۔ کفایت کی موجودگی میں اس نے کوئی حجاب محسوس نہ کیا۔ بڑے سکون سے وہ اپنا سیاہ کرتا استری کرتی رہی کفایت نے دیکھا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی گول چھاتیوں کے درمیانی حصے میں استری کی گرمی کے باعث پسینے کی ننھی ننھی بوندیں جمع ہو گئی تھیں۔

کفایت نے گیان کے بارے میں پوچھنے کے لئے بشیر کو آواز دینا چاہی مگر رک گیا۔ اس نے مناسب خیال نہ کیا کیونکہ وہ لڑکی آدھی ننگی تھی اس نے

ہیٹ اُتار کر ایک طرف رکھا۔ تھوڑی دیر اس نیم عُریانی کو دیکھتا رہا مگر اُسے دیکھ کر کوئی ہیجان محسوس نہ کیا۔ لڑکی کا بدن بے داغ تھا۔ جلد نہایت ہی ملائم تھی، اتنی ملائم کہ نگاہیں پھسل پھسل جاتی تھیں۔

کُرتا استری ہو گیا تو اس نے سوئچ اوف کیا ایک کرتہ اور بھی تھا سفید بوسکی کا جو تہہ کیا ہوا استری شدہ پائجامہ پر رکھا۔ اس نے یہ سب کپڑے اٹھائے اور کفایت سے مخاطب ہوئی "میں نہانے چلی ہوں"

یہ کہہ کر وہ نہانے چلی گئی۔ کفایت ٹوپی اُتار کر سر کھجلانے لگا "کون ہے یہ؟"

اس کے دماغ میں بڑی کھُد بُد ہو رہی تھی، جب بھی وہ اس لڑکی کے متعلق سوچتا سارا واقعہ اس کے سامنے آجاتا۔ رات کو اس کا ٹھنڈا پانی ہی پانی۔ اس کا دروازہ کھولنا اور کہنا "پانی" اور گیان کا یہ جواب دینا۔ "پانی نہیں" "عورت" اور ایک ننھی سی گڑیا کا چھم سے اندر آجانا۔

کفایت نے دل میں کہا ہٹاؤ جی۔ گیان آئے گا تو سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔ لونڈیا ہے دلچسپ۔ اتنی چھوٹی ہے کہ جی چاہتا ہے کہ آدمی جیب ——— میں رکھ لے۔ چلو برانڈی پئیں"

بشیر نے گلاس، برانڈی اور برف وغیرہ سب کچھ ملاقاتی کمرے میں تپائی پر رکھ دیا تھا۔ کفایت نے کپڑے بدلے اور پینا شروع کر دی۔ پہلا پگ ختم کیا تو اسے غسل خانے کا دروازہ کھلنے کی "چوں" سنائی دی، دوسرا پگ ڈال کر وہ انتظار کرنے لگا کہ تھوڑی ہی دیر میں وہ بری لڑکی ضرور

ادھر آتے گی اُس کے مقررہ چار پیگ ختم ہو گئے۔ مگر وہ نہ آئی۔ گیان بھی نہ آیا۔ کفایت جھنجھلا گیا۔ اندر بیڈ روم میں جا کر اس نے دیکھا وہ لڑکی استری کئے ہوئے کپڑے پہنے اپنی گول گول چھاتیوں پہ ہاتھ رکھے بڑے اطمینان سے سو رہی تھی۔ استری والی میز پر اس کے سلیپنگ سوٹ کا اکلوتا پائجامہ بڑی اچھی طرح تہہ کیا ہوا رکھا تھا۔

کفایت نے واپس جا کر برانڈی کا ایک ڈبل پگ گلاس میں ڈالا اور نیٹ ہی چڑھا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس کا سر گھومنے لگا۔ اس نے بری لڑکی کے متعلق سوچنے کی کوشش کی۔ مگر اس نے محسوس کیا کہ وہ چلوؤں میں پانی بھر بھر کے اس کے دماغ میں ڈال رہی ہے۔ کھانا کھائے بغیر وہ صوفے پر لیٹ گیا اور اس بری لڑکی کے متعلق کچھ سوچنے کی کوشش کرتے ہوئے سو گیا۔

صبح ہوئی تو اس نے دیکھا کہ وہ صوفے کی بجائے اندر پلنگ پر ہے۔ اس نے حافظے پہ زور دیا۔ "میں رات کب آیا یہاں۔ کیا میں نے کھانا کھایا تھا؟"

کفایت کو کوئی جواب نہ ملا۔ سامنے والا پلنگ خالی تھا۔ اس نے زور سے بشیر کو آواز دی۔ وہ بھاگا اندر آیا۔ کفایت نے اس سے پوچھا۔ "گیان صاحب کہاں ہیں؟"

بشیر نے جواب دیا۔ "رات کو نہیں آتے۔"

"کیوں؟"

"معلوم نہیں صاحب۔"

"وہ بائی جی کہاں ہیں؟"

"مچھلی تل رہی ہیں۔"

کفایت کے دماغ میں مچھلیاں تلی جانے لگیں۔ اٹھ کر باورچی خانے میں گیا تو وہ چوکی پر بیٹھی سامنے انگیٹھی رکھے مچھلی تل رہی تھی۔ کفایت کو دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر ایک چھوٹی سی مسکراہٹ پیدا ہوئی۔ ہاتھ اٹھا کر اس نے سلام کیا اور اپنے کام میں مشغول ہو گئی۔ کفایت نے دیکھا تینوں نوکر بے حد مسرور تھے اور بڑی مستعدی سے اس لڑکی کا ہاتھ بٹا رہے تھے۔

بشیر کو کچھ دنوں کی چھٹی پر اپنے وطن جانا تھا۔ کئی دنوں سے وہ بار بار کہتا تھا کہ صاحب مجھے تنخواہ دے دیجئے مجھے گھر سے کئی خط آ چکے ہیں۔ وہاں وہ بیمار ہے۔ رات کو وہ اسے تنخواہ دینا بھول گیا تھا۔ اب اسے یاد آیا تو اس نے بشیر سے کہا "ادھر آؤ بشیر۔ اپنی تنخواہ لے لو۔ میں کل دفتر سے روپے لے آیا تھا۔"

بشیر نے تنخواہ لے لی۔ کفایت نے اس سے کہا "نو بجے گاڑی جاتی ہے۔ اس سے چلے جاؤ۔"

"اچھا جی!" یہ کہہ کر بشیر چلا گیا۔

ناشتہ بے حد لذیذ تھا۔ خاص طور پر مچھلی کے ٹکڑے اس نے کھانا شروع کرنے سے پہلے بشیر کے ذریعے سے اس برمی لڑکی کو بلا بھیجا۔ مگر وہ

نہ آئی۔ بشیر نے کہا "جی وہ کہتی ہیں کہ بعد میں کریں گی وہ ناشتہ"
کفایت کی مالی حالت بہت پتلی تھی۔ گیان بھی آسودہ حال نہیں تھا۔
دونوں اِدھر اُدھر سے پکڑ کر گزارہ کر رہے تھے۔ بہرا نٹ کی کا بندوبست
گیان کر دیتا تھا۔ باقی کھانے پینے کا سلسلہ بھی کسی نہ کسی طرح چل ہی رہا
تھا۔ جس فلم کمپنی میں گیان کام کر رہا تھا اس کا دیوالہ نکلنے کے قریب تھا
مگر اس کو یقین تھا کہ کوئی معجزہ ضرور رونما ہوگا اور اس کی کمپنی سنبھل
جائے گی۔ شوٹنگ ہو رہی تھی غالباً اسی لئے گیان رات کو نہ آسکا تھا۔
ناشتہ کرنے کے بعد کفایت نے جھانکا کہ باورچی خانے میں دیکھا۔
لڑکی اپنے کام میں مشغول تھی تینوں ملازم لڑکے اس سے ہنس ہنس کر
باتیں کر رہے تھے۔ کفایت نے بشیر سے کہا "مچھلی بہت اچھی تھی"
لڑکی نے مڑ کر دیکھا اس کے ہونٹوں پر چھوٹی سی مسکراہٹ تھی
کفایت دفتر چلا گیا اس کو امید تھی کہ کچھ روپوں کا بندوبست ہو جائے
گا۔ لیکن خالی جیب واپس آیا۔ بڑی لڑکی اندر بیڈ روم میں لیٹی تصویروں
والا رسالہ دیکھ رہی تھی۔ کفایت کو دیکھ کر بیٹھ گئی اور سلام کیا۔
کفایت نے سلام کا جواب دیا اور اس سے پوچھا "گیان صاحب
آئے تھے"
"آئے تھے دوپہر کو۔ کھانا کھا کر چلے گئے۔ پھر شام کو آئے چند
منٹوں کے لئے" یہ کہہ کر اس نے ایک طرف ہٹ کر تکیہ اٹھایا اور کاغذ میں
لپٹی ہوئی بوتل نکالی "یہ دے گئے تھے کہ میں آپ کو دیدوں"

کفایت نے بوتل پکڑ لی۔ کاغذ پر گیان کے یہ چند الفاظ تھے "کم بخت یہ چیز کسی نہ کسی طرح مل جاتی ہے لیکن پیسہ نہیں ملتا۔ بہرحال عیش کرو۔ تمہارا گیان"

اس نے کاغذ کھولا۔ برانڈی کی بوتل تھی۔ بری لڑکی نے کفایت کی طرف دیکھا۔ اور مسکرائی۔ کفایت بھی مسکرا دیا۔ "آپ پیتی ہیں؟"

لڑکی نے زور سے اپنا سر ہلایا۔ "نہیں!"

کفایت نے نظر بھر کر اس کو دیکھا اور سوچا۔ کیا چھوٹی سی ننھی منی گڑیا ہے!

اس کا جی چاہا کہ وہ اس کے ساتھ بیٹھ کر باتیں کرے۔ چنانچہ اس سے مخاطب ہوا۔ "آیئے ادھر دوسرے کمرے میں بیٹھتے ہیں"

"نہیں۔ میں کپڑے دھوؤں گی"

"اس وقت؟"

"اس وقت اچھا ہوتا ہے۔ رات دھوئے صبح سوکھ گئے۔ اٹھتے ہی استری کر لیے"

کفایت تھوڑی دیر کھڑا رہا اسے کوئی بات نہ سوجھی تو ملاقاتی کمرے میں بیٹھ کر برانڈی پینا شروع کر دی۔ کھانے کا وقت ہو گیا۔ اس نے بری لڑکی کو بلایا مگر اس نے کہا۔

"میں گیان صاحب کے ساتھ کھاؤں گی"

کفایت نے کھانا کھایا اور اپنے پلنگ پر سو گیا۔ رات کے تقریباً ایک بجے اس کی آنکھ کھلی چاندنی رات تھی ہلکی ہلکی روشنی کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔

ہوا بھی بڑے مزے کی چل رہی تھی۔ کروٹ بدلی تو دیکھا سامنے پلنگ پر ایک چھوٹی سی سڈول گڑیا گیان کے چوڑے بالوں بھرے سینے سے ساتھ چمٹی ہوئی ہے۔ کفایت نے آنکھیں بند کر لیں۔ تھوڑے وقفے کے بعد گیان کی آواز آئی "جاؤ اب مجھے سونے دو۔ کپڑے پہن لو۔"

اسپرنگوں والے پلنگ کی آواز کے ساتھ ساتھ ریشم کی سرسراہٹیں کفایت کے کانوں میں داخل ہوئیں۔ تھوڑی دیر کے بعد کفایت سو گیا۔ صبح چھ بجے اٹھا، کیونکہ وہ رات کو یہ سوچ کر سویا تھا کہ صبح جلدی اٹھے گا اسے بڑام کا بہت لمبا سفر طے کر کے ایک آدمی کے پاس جانا تھا۔ جس سے اسے کچھ ملنے کی امید تھی پلنگ پر سے اترا تو اس نے دیکھا کہ بری لڑکی ننگے فرش پر اس کے سلیپنگ سوٹ کا اکلوتا پائجامہ پہنے اپنے چھوٹے سے سڈول بازو کو سر کے نیچے رکھے بڑے سکون سے سو رہی ہے، کفایت نے اس کو جگایا۔ اس نے اپنی کالی کالی آنکھیں کھولیں، کفایت نے اس سے کہا "آپ یہاں کیوں لیٹی ہیں؟"

اس کے چھوٹے چھوٹے ہونٹوں پر ننھی سی مسکراہٹ پیدا ہوئی اٹھ کر اس نے جواب دیا "گیان کو عادت نہیں کسی کو اپنے پاس سلانے کی۔"

کفایت کو گیان کی اس عادت کا علم تھا۔ اس نے لڑکی سے کہا "جائیے میرے پلنگ پر لیٹ جائیے۔"

لڑکی اٹھی اور کفایت کے پلنگ پر لیٹ گئی۔

کفایت غسل خانے میں گیا وہاں رسی پر بری لڑکی کے کپڑے لٹک رہے تھے۔ کفایت صابن مل کر نہانے لگا تو اس کا خیال اس لڑکی کے ملائم جسم

کی طرف چلا گیا۔ جس پر سے نگاہیں پھسلی پھسلی جاتی تھیں۔

غسل سے فارغ ہو کر کفایت نے کپڑے پہنے، چونکہ جلدی میں تھا اس لئے گیان کو جگا کر اس سے کوئی بات نہ کر سکا۔ صبح کا نکلا رات کے گیارہ بجے واپس آیا۔ جیبیں خالی تھیں۔ بیڈ روم میں گیا تو گیان اور بری لڑکی دونوں اکٹھے لیٹے ہوئے تھے۔ کفایت نے ملاقاتی کمرے میں بیٹھ کر برانڈی پینی شروع کر دی۔ بہت تھکا ہوا تھا۔ مایوس واپس آیا تھا۔ بری لڑکی کے متعلق سوچتے سوچتے وہیں صوفے پر سو گیا۔ صبح پانچ بجے اٹھا۔ تپائی پر اس کا چوتھا پیگ پانی میں پڑا باسی ہو رہا تھا۔

کفایت اٹھا بیڈ روم کے ننگے فرش پر بری لڑکی سو رہی تھی۔ گیان الماری کے آئینے کے سامنے کھڑا ٹائی باندھ رہا تھا۔ ٹائی کی گرہ ٹھیک کر کے اس نے دونوں ہاتھوں میں لڑکی کو اٹھایا اور اپنے پلنگ پر لٹا دیا۔ مڑا تو اس نے کفایت کو دیکھا۔ کیوں بھئی۔ کچھ بندوبست ہوا روپوں کا؟

کفایت نے بڑی مایوسی سے کہا "نہیں"

"تو میں جاتا ہوں۔ دیکھو شاید کچھ ہو جائے"

پیشتر اس کے کہ کفایت اسے روکے گیان تیزی سے باہر نکل گیا۔ دروازہ کھلا تو اس کی آواز آئی "تم بھی کوشش کرنا کفایت"

کفایت نے پلٹ کر پلنگ کی طرف دیکھا۔ لڑکی بڑے سکون کے ساتھ سو رہی تھی اس کے ننھے سے سینے پر چھوٹی چھوٹی گول گول چھاتیاں چمک رہی تھیں۔ کفایت کمرے سے نکل کر غسل خانے میں چلا گیا اندر سستی پر لڑکی کے

دھلے ہوئے کپڑے لٹک رہے تھے۔

غسل خانے سے فارغ ہو کر باہر نکلا تو اس نے دیکھا لڑکی نوکروں کے ساتھ ناشتہ تیار کرنے میں مصروف تھی۔ ناشتہ کر کے باہر نکل گیا۔

چار روز اسی طرح گزر گئے۔ کفایت کو اس لڑکی کے متعلق کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ گیان کبھی رات کو دیر سے آتا تھا کبھی دن کو بہت جلدی نکل جاتا تھا۔ یہی حال کفایت کا تھا۔ دونوں پریشان تھے۔ پانچویں روز جب وہ صبح اٹھا تو بشیر نے کفایت کو گیان کا رقعہ دیا۔ اس میں لکھا تھا "خدا کے لئے کسی نہ کسی طرح دس روپے پیدا کر کے برمی لڑکی کو دیدو۔"

لڑکی کھڑکی استری کر رہی تھی۔ بلاؤز کی صرف آستین باقی رہ گئی تھی جس پر وہ بڑے سلیقے سے استری پھیر رہی تھی۔ کفایت نے اس کی طرف دیکھا۔ جب اس کی نگاہیں چار ہوئیں تو برمی لڑکی مسکرا دی۔ کفایت سوچنے لگا کہ وہ دس روپے کہاں سے پیدا کرے۔ بشیر پاس کھڑا تھا۔ اس نے کفایت سے کہا۔ "صاحب ادھر آئیے۔"

کفایت نے پوچھا "کیا بات ہے؟"

"جی کچھ کہنا ہے۔"

بشیر نے ایک طرف ہٹ کر دس روپے کا نوٹ نکالا اور کفایت کو دیدیا۔ "میں نہیں گیا ابھی تک صاحب۔"

کفایت نوٹ لے کر سوچنے لگا۔ "نہیں نہیں۔ تم رکھو۔ لیکن تم گئے کیوں نہیں ابھی تک!"

"صاحب چلا جاؤں گا کل پرسوں۔ آپ رکھئے یہ روپے۔"

کفایت نے نوٹ جیب میں ڈال لیا۔ "اچھا میں شام کو لوٹا دوں گا تمہیں۔"

کپڑے وپڑے پہن کر جب بری لڑکی ناشتہ کر چکی تو کفایت نے اس کو دس روپے کا نوٹ دیا اور کہا۔ "گیان صاحب نے دیا تھا کہ آپ کو دیدوں۔"

لڑکی نے نوٹ لے لیا اور بشیر کو آواز دی۔ بشیر آیا تو اس سے کہا۔ "جاؤ ٹیکسی لے آؤ۔"

بشیر چلا گیا تو کفایت نے اس سے پوچھا۔ "آپ جا رہی ہیں؟"

"جی ہاں!"

یہ کہہ کر وہ اٹھی اور بیڈ روم میں چلی گئی۔ وہ اپنا رومال استری کرنا بھول گئی تھی۔ کفایت نے اس سے باتیں کرنے کا ارادہ کیا تو ٹیکسی آ گئی۔ رومال ہاتھ میں لے کر وہ روانہ ہونے لگی۔ کفایت کو سلام کیا اور کہا۔ "اچھا جی۔ میں چلتی ہوں۔ گیان کو میرا سلام بول دینا۔"

پھر اس نے تینوں نوکروں سے ہاتھ ملایا اور چلی گئی۔ سب کے چہروں پر اداسی چھا گئی۔

پونے گھنٹے کے بعد گیان آیا۔ وہ کچھ لے کر آیا تھا۔ آتے ہی اس نے کفایت سے پوچھا۔ "کہاں ہے وہ بری لڑکی؟"

"چلی گئی۔"

"وہ کیسے؟ دس روپے دئے تھے تم نے اسے؟"

"ہاں۔"

"تو ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے!" گیان کرسی پر بیٹھ گیا۔

کفایت نے پوچھا "کون تھی یہ لڑکی؟"

"معلوم نہیں۔"

کفایت سرتاپا حیرت بن گیا۔ کیا مطلب؟"

گیان نے جواب دیا "مطلب یہی کہ میں نہیں جانتا کون تھی۔"

"جھوٹ!"

"تمہاری قسم سچ کہتا ہوں۔"

کفایت نے پوچھا "کہاں سے مل گئی تھی تمہیں؟"

گیان نے ٹانگیں میز پر رکھ دیں اور مسکرایا "عجیب داستان ہے یار۔ پانی کا سیلاب آنے والی رات میں شنکر کے ہاں چلا گیا۔ وہاں بہت پی۔ اندھیری اسٹیشن سے گاڑی میں سوار ہوا تو سو گیا۔ گاڑی مجھے سیدھی چرچ گیٹ لے گئی۔ وہاں مجھے چوکیدار نے جگایا کہ اٹھو۔ میں نے کہا بھئی مجھے گرانٹ روڈ جانا ہے۔ چوکیدار ہنسا۔ آپ پانچ اسٹیشن آگے چلے آئے ہیں۔ اترا۔ دوسرے پلیٹ فارم پر اندھیری جانے والی آخری گاڑی کھڑی تھی۔ اس میں سوار ہو گیا۔ گاڑی چلی تو پھر مجھے نیند آ گئی۔ سیدھا اندھیری پہنچ گیا۔"

کفایت نے پوچھا "مگر اس سے لڑکی کا کیا تعلق؟"

"تم سن تو لو" گیان نے سگریٹ سلگایا "اندھیری پہنچا یعنی جب میری آنکھ کھلی تو کیا دیکھتا ہوں۔ میں ایک چھوٹی سی لونڈیا کے ساتھ چمٹا ہوں۔ پہلے تو میں ڈرا۔ وہ جاگ رہی تھی میں نے پوچھا، کون ہو تم؟ — وہ مسکرائی

میں نے پھر پوچھا، کون ہو بھئی تم۔ وہ مسکرائی اور کہنے لگی لو اتنی دیر سے مجھے چومتے رہے اور اب پوچھتے ہو میں کون ہوں۔ میں نے حیرت سے کہا اچھا ۔ وہ ہنسنے لگی۔ میں نے دماغ پر زور دے کر سوچنا مناسب خیال نہ کیا اور اس کو اپنے ساتھ بھینچ لیا۔ صبح تین بجے تک ہم دونوں۔ پلیٹ فارم کی ایک بنچ پر سوتے رہے، ساڑھے تین کی پہلی گاڑی آئی تو اس میں سوار ہو گئے میرا ارادہ تھا کہ بندوبست کر کے اس کو کچھ روپے دوں گا۔ یہاں پہنچے تو پانی کا طوفان آیا ہوا تھا۔ ہے نا دلچسپ داستان"

کفایت نے کہا "خاصی دلچسپ ہے۔ مگر وہ اتنے دن کیوں رہی یہاں؟"

گیان نے سگریٹ فرش پر پھینکا "وہ کہاں رہی۔ میں نے اسے رکھا۔ ۔ اصل میں وہ یوں رہی کہ میرے پاس کچھ تھا ہی نہیں جو اسے دیتا۔ بس دن گزرتے گئے۔ میں بے حد شرمندہ تھا۔ کل رات میں نے اس سے صاف کہہ دیا کہ دیکھو بھئی، دن بڑھتے جا رہے ہیں تم ایسا کرو مجھے اپنا اڈرس دیدو۔ میں تمہارا حق تمہیں وہاں پہنچا دوں گا۔ آج کل میرا حال بہت پتلا ہے"

کفایت نے پوچھا "یہ سن کر اس نے کیا کہا؟"

گیان نے سر کو جنبش دی "عجیب ہی لڑکی تھی۔ کہنے لگی یہ کیا کہتے ہو میں نے تم سے کب مانگا ہے۔ لیکن دس روپے مجھے دیدینا۔ میرا گھر یہاں سے بہت دور ہے ٹیکسی میں جاؤں گی میرے پاس ایک بھی پیسہ نہیں۔"

کفایت نے سوال کیا "نام کیا تھا اس کا؟"

گیان سوچنے لگا۔

"بھول گئے؟"

گیان نے اپنی ٹانگیں میز پر سے ہٹائیں "نہیں یار۔ میں نے اس سے نام نہیں پوچھا۔ مدہ ہو گئی" یہ کہہ کر وہ ہنسنے لگے۔

۱۰ر جون ۱۹۵۰ء

فوبھابائی

حیدرآباد سے شہاب آیا تو اس نے بمبئی سنٹرل اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر پہلا قدم رکھتے ہی حنیف سے کہا "دیکھو بھائی، آج شام کو وہ معاملہ ضرور ہو گا۔ ورنہ یاد رکھو میں واپس چلا جاؤں گا۔"

حنیف کو معلوم تھا کہ "وہ معاملہ" کیا ہے۔ چنانچہ شام کو اس نے ٹیکسی لی۔ شہاب کو ساتھ لیا۔ گرانٹ روڈ کے ناکے پر ایک دلال کو بلایا اور اس سے کہا۔ "میرے دوست حیدرآباد سے آئے ہیں۔ ان کے لئے ایک اچھی چھوکری چاہیئے۔"

دلال نے اپنے کان سے اڑسی ہوئی بیڑی نکالی اور اس کو ہونٹوں میں دبا کر کہا "دکنی چلے گی؟"

حنیف نے شہاب کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ شہاب نے کہا
"نہیں بھائی۔ مجھے کوئی مسلمان چاہیئے۔"
"مسلمان؟" دلال نے بیڑی کو چوسا۔ "چلئے" اور یہ کہہ کر وہ ٹیکسی کی اگلی نشست پر بیٹھ گیا۔ ڈرائیور سے اس نے کچھ کہا۔ ٹیکسی اسٹارٹ ہوئی۔ اور مختلف بازاروں سے ہوتی ہوئی فورجٹ اسٹریٹ کی ساتھ والی گلی میں داخل ہوئی۔ یہ گلی ایک پہاڑی پر تھی۔ بہت اونچان تھی۔ ڈرائیور نے گاڑی کو فرسٹ گیر میں ڈالا۔ حنیف کو ایسا محسوس ہوا کہ راستے میں ٹیکسی رک کر واپس چلنا شروع کر دے گی۔ مگر ایسا نہ ہوا۔ دلال نے ڈرائیور کو اونچان کے عین آخری سرے پر جہاں چوک سا بنا تھا رکنے کے لئے کہا۔

حنیف کبھی اس طرف نہیں آیا تھا۔ اونچی پہاڑی تھی جس کے دائیں طرف ایک دم ڈھلان تھی۔ جس بلڈنگ میں دلال داخل ہوا اس کی صرف دو منزلیں تھیں۔ حالانکہ دوسری طرف کی بلڈنگیں سب کی سب چار منزلہ تھیں حنیف کو بعد میں معلوم ہوا کہ ڈھلان کے باعث اُس بلڈنگ کی تین منزلیں نیچے تھیں۔ جہاں لفٹ جاتی تھی۔

شہاب اور حنیف خاموش بیٹھے رہے۔ انہوں نے کوئی بات نہ کی راستے میں دلال نے اس لڑکی کی بہت تعریف کی تھی جس کو لانے وہ اس بلڈنگ میں گیا تھا۔ اس نے کہا تھا "بڑے اچھے خاندان کی لڑکی ہے۔ اسپیشل طور پر آپ کے لئے نکال رہا ہوں۔"

دونوں سوچ رہے تھے یہ لڑکی کیسی ہوگی جو اسپیشل طور پر نکالی جا رہی ہے۔

تھوڑی دیر کے بعد دلال نمودار ہوا وہ اکیلا تھا۔ ڈرائیور سے اس نے کہا "گاڑی واپس کرو" یہ کہہ کر وہ اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ گاڑی ایک چکر لے کر مڑی، تین چار بلڈنگیں چھوڑ کر دلال نے ڈرائیور سے کہا۔ "روک لو" پھر حنیف سے مخاطب ہوا "آ رہی ہے پوچھ رہی تھی کیسے آدمی ہیں میں نے کہا نمبر دار"

دس پندرہ منٹ کے بعد ٹیکسی کا دروازہ کھلا اور ایک عورت حنیف کے ساتھ بیٹھ گئی۔ رات کا وقت تھا گلی میں روشنی کم تھی اس لئے شہاب اور حنیف دونوں اس کو اچھی طرح نہ دیکھ سکے سیٹ پر بیٹھتے ہی اس نے کہا "چلو"

ٹیکسی تیزی سے نیچے اُترنے لگی۔

حنیف کے پاس کوئی جگہ نہ تھی جہاں کوئی معاملہ ہو سکے چنانچہ جیسا طے پایا تھا وہ ڈاکٹر خاں صاحب کے ہاں چلے گئے۔ وہ ملٹری ہاسپٹل میں متعین تھا۔ اور اس کو وہیں دو کمرے ملے ہوئے تھے۔ شہاب نے بمبئی آتے ہی اس کو فون کر دیا تھا کہ وہ حنیف کے ساتھ رات کو اس کے پاس آئے گا۔ اور معاملہ ساتھ ہوگا، چنانچہ ٹیکسی ملٹری ہسپتال میں پہنچی۔ دلال سو روپے لے کر گرانٹ روڈ پر اُتر گیا۔

راستے میں بھی شہاب اور حنیف اس عورت کو اچھی طرح نہ دیکھ سکے۔ کوئی خاص باتیں بھی نہ ہوئیں۔ شہاب نے جب اس سے اپنے ٹھیٹ حیدرآبادی لہجے میں پوچھا "آپ کا اسم گرامی" تو اس عورت نے کہا "فوبھا بائی"۔

"فوبھا بائی؟" حنیف سوچتا رہ گیا کہ یہ کیسا نام ہے۔

ڈاکٹر خان ان کا انتظار کر رہا تھا۔ سب سے پہلے شہاب کمرے میں داخل ہوا۔ دونوں گلے ملے اور خوب ایک دوسرے کو گالیاں دیں۔

ڈاکٹر خان نے جب ایک جوان عورت کو دروازے میں دیکھا تو ایکدم خاموش ہو گیا۔ "آئیے آئیے" اس نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھا۔

"ڈاکٹر خان — آپ؟" اس نے شہاب کی طرف دیکھا۔

شہاب نے اس عورت کی طرف دیکھا۔ عورت نے کہا "فوبھا بائی"۔

ڈاکٹر خان نے بڑھ کر اس سے ہاتھ ملایا "آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی"

فوبھا بائی مسکرائی "مجھے بھی خوشی ہوئی"

شہاب اور حنیف نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ڈاکٹر خان نے دروازہ بند کر دیا اور اپنے دوستوں سے کہا "آپ دوسرے کمرے میں چلے جائیے۔ مجھے کچھ کام کرنا ہے"

شہاب نے جب فوبھا بائی سے کہا "چلیے" تو اس نے ڈاکٹر خان کا ہاتھ پکڑ لیا "نہیں آپ بھی تشریف لائیے"

"آپ تشریف لے چلیے میں آتا ہوں" یہ کہہ کر ڈاکٹر خان نے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔

شہاب اور حنیف فوبھا بائی کو اندر لے گئے۔ تھوڑی دیر گفتگو ہوئی تو ان کو معلوم ہوا کہ اس کی زبان موٹی تھی۔ وہ شین اور سین ادا نہیں کر سکتی تھی۔ اس کے بارے اس کے منہ سے فے نکلتی تھی۔ اس کا نام اس لحاظ سے شوبھا بائی تھا۔ لیکن کچھ دیر اور باتیں کرنے کے بعد ان کو پتہ چلا کہ شوبھا بائی اس کا اصلی نام نہیں تھا۔ وہ مسلمان تھی۔ جے پور اس کا وطن تھا۔ جہاں سے وہ چار سال ہوئے بھاگ کر بمبئی چلی آئی تھی۔ اس سے زیادہ اس نے اپنے حالات نہ بتائے۔

معمولی شکل وصورت تھی۔ آنکھیں بڑی نہیں تھیں۔ ناک بھی خوش وضع تھی۔ بالائی ہونٹ کے عین درمیان ایک چھوٹے سے زخم کا نشان تھا۔ جب وہ بات کرتی تھی تو یہ نشان تھوڑا سا پھیل جاتا۔ گلے میں اس نے جڑاؤ نکلس پہنا ہوا تھا۔ دونوں ہاتھوں میں سونے کی چوڑیاں تھیں۔

بہت ہی باتونی عورت تھی۔ بیٹھتے ہی اس نے ادھر ادھر کی باتیں شروع کر دیں۔ حنیف اور شہاب صرف ہوں ہاں کرتے رہے۔ پھر اس نے ان کے بارے میں پوچھنا شروع کیا کہ وہ کیا کرتے ہیں، کہاں رہتے ہیں۔ کیا عمر ہے۔ فادی فدہ ہیں یا غیر فادی فدہ۔ حنیف اتنا دبلا کیوں ہے۔ شہاب نے دو مصنوعی دانت کیوں لگوائے ہیں۔ گفت خوردہ تھا تو اس کا علاج ڈاکٹر خان سے کیوں نہ کرایا۔ فرماتا کیوں ہے۔ فعر کیوں نہیں گاتا۔

شہاب نے اسے کچھ شعر سنائے۔ شوبھا نے بڑے زوروں کی داد دی۔ جب شہاب نے یہ شعر سنایا۔

کھیتوں کو دے لو پانی اب بہہ رہی ہے گنگا"
کچھ کر لو نوجوانو اٹھتی جوانیاں ہیں

تو شوبھا اُچھل پڑی۔" واہ جناب صاحب واہ۔ بہت اچھا شعر ہے۔ اٹھتی جوانیاں ہیں۔ واہ وا!"

اس کے بعد شوبھا نے بے شمار شعر سنائے۔ بالکل بے جوڑ بے تکے۔ جن کا سر تھا نہ پیر۔ شعر سنا کر اس نے شہاب سے کہا۔" فہاب صاحب۔ مزا آیا آپ کو۔"

شہاب نے جواب دیا" بہت"

شوبھا نے شرما کر کہا" یہ شعر میرے تھے۔ مجھے شاعری کا بہت شوق ہے۔"

شہاب اور حنیف دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور مسکرا دیئے۔

۔ اس کے بعد صرف ایک صحیح شعر شوبھا نے سنایا ؎

"کبھی تو میرے دردِ دل کی خبر لے
مرے درد سے آشنا ہونے والے"

یہ شعر حنیف کئی بار سن چکا تھا اور شاید پڑھ بھی چکا تھا۔ مگر شوبھا نے کہا۔" حنیف صاحب یہ شعر بھی میرا ہے۔"

حنیف نے خوب داد دی۔" ماشاءاللہ آپ تو کمال کرتی ہیں"

شوبھا چونکی۔" معاف کیجئے گا۔ میری زبان میں تو کچھ خرابی ہے لیکن آپ نے کیوں ماشاءاللہ کے بدلے ماشاءاللہ کہا۔"

حنیف اور شہاب دونوں بے اختیار ہنس پڑے، شوبھا بھی ہنسنے

لگی اتنے میں ڈاکٹر خان آ گیا۔ اس نے اندر داخل ہوتے ہی شوبھا سے کہا:
"کیوں جناب اتنی ہنسی کس بات پر آ رہی ہے؟"
زیادہ ہنسنے کے باعث شوبھا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے اس نے رومال سے ان کو پونچھا اور ڈاکٹر خان سے کہا: "ایک بات ایسی ہوئی کہ ہم سب ہنس پڑے۔"
ڈاکٹر خان نے ہنسنا شروع کر دیا۔
شوبھا نے اس سے کہا: "آیئے بیٹھیے۔" چارپائی کے ایک طرف سرک کر اس نے ڈاکٹر خان کا ہاتھ پکڑا اور اسے اپنے پاس بٹھا لیا۔
پھر شعر و شاعری شروع ہو گئی۔ شوبھا نے لمبی لمبی بیسیوں غزلیں سنائیں سب نے داد دی۔ شہاب اکتا گیا۔ وہ معاملہ چاہتا تھا۔ حنیف اس کے بدلے ہوئے تیور دیکھ کر بھانپ گیا۔ چنانچہ اس نے شہاب سے کہا: "اچھا بھائی میں رخصت چاہتا ہوں، انشاء اللہ کل صبح ملاقات ہو گی۔"
وہ یہ کہہ کر کرسی پر سے اٹھا مگر شوبھا نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔
"نہیں آپ نہیں جا سکتے۔"
حنیف نے جواب دیا: "میں معذرت چاہتا ہوں۔ بیوی میرا انتظار کر رہی ہو گی۔"
"اوہ! لیکن نہیں۔ آپ تھوڑی دیر اور ضرور بیٹھیں۔ ابھی تو صرف گیارہ بجے ہیں۔" شوبھا نے اصرار کیا۔
شہاب نے ایک جمائی لی: "بہت وقت ہو گیا ہے۔"

شوبھا نے مسکرا کر شہاب کی طرف دیکھا "میں ساری رات آپ کے پاس ہوں۔" شہاب کا تکدر دور ہو گیا۔

حنیف تھوڑی دیر بیٹھا، پھر رخصت لی اور چلا گیا۔ دوسرے روز صبح نو بجے کے قریب شہاب آیا اور رات کی بات سنانے لگا۔ عجیب و غریب عورت تھی یہ فوجا بائی۔ پیٹ پر بالشت بھر آپریشن کا نشان تھا۔ کہتی تھی کہ وہ ایک لکڑی والے سیٹھ کی داشتہ تھی۔ اس نے ایک فلم کمپنی کھول دی تھی اس کے چیکوں پر دستخط شوبھا ہی کے ہوتے تھے۔ موٹر تھی۔ جو اب تک موجود ہے نوکر چاکر تھے۔ لکڑی والا سیٹھ اس سے بے حد محبت کرتا تھا۔ اس کے پیٹ کا آپریشن ہوا تو اس نے ایک ہزار روپے یتیم خانے کو دے دیے۔

حنیف نے پوچھا "یہ لکڑی والا سیٹھ اب کہاں ہے؟"

شہاب نے جواب دیا "دوسری دنیا میں ٹاں کھولے بیٹھا ہے۔ عورت خوب تھی یہ فوجا بائی۔ میں دوسرے کمرے میں سو گیا۔ تو وہ ڈاکٹر خان کے ساتھ لیٹ گئی۔ صبح پانچ بجے خان نے اس سے کہا کہ اب جاؤ۔ شوبھا نے کہا کہ اچھا میں جاتی ہوں، لیکن یہ میرے زیور تم اپنے پاس رکھ لو۔ میں اکیلی ان کے ساتھ باہر نہیں نکلتی۔"

حنیف نے پوچھا "ڈاکٹر نے زیور رکھ لیے؟"

شہاب نے سر ہلایا "ہاں۔ پہلے تو اس کا خیال تھا کہ نقلی ہیں مگر دن کی روشنی میں جب اس نے دیکھا تو اصلی تھے۔"

"اور وہ چلی گئی؟"

"ہاں چلی گئی ۔ یہ کہہ کر کہ وہ کسی روز آ کر اپنے زیور واپس لے جائے گی۔"

"یہ تم نے بڑے اچنبھے کی بات سنائی۔"

"خدا کی قسم حقیقت ہے۔" شہاب نے سگریٹ سلگایا۔ "اسی لئے تو میں نے کہا یہ فوبھا بائی عجیب و غریب عورت ہے۔"

حنیف نے پوچھا۔ "ویسے کیسی عورت تھی؟"

شہاب جھینپ سا گیا۔ "بھئی مجھے ایسے معاملوں کا کچھ پتہ نہیں۔ یہ تم خان سے پوچھنا۔ وہ اکسپرٹ ہے۔"

شام کو دونوں خان سے ملے، زیور اس کے پاس محفوظ تھے۔ شوبھا لینے نہیں آئی تھی۔ خان نے بتایا۔ "میرا خیال ہے شوبھا کسی دماغی صدمے کا شکار ہے۔"

شہاب نے پوچھا۔ "تمہارا مطلب ہے پاگل ہے؟"

خان نے کہا۔ "نہیں۔ پاگل نہیں ہے۔ لیکن اس کا دماغ یقیناً نورمل نہیں ہے۔ بے حد مخلص عورت ہے۔ ایک لڑکا ہے اس کا جے پور میں۔ اس کو برابر دو سو روپے ماہوار بھیجتی ہے۔ ہر تیسرے مہینے اس سے ملنے جاتی ہے۔ جے پور پہنچتے ہی برقع اوڑھ لیتی ہے۔ وہاں اسے پردہ کرنا پڑتا ہے۔"

حنیف نے کہا۔ "یہ تم نے کیسے سمجھا کہ اس کا دماغ نورمل نہیں۔"

خان نے جواب دیا۔ "بھئی میرا خیال ہے۔ نورمل عورت ہوتی تو اپنے ڈیڑھ دو ہزار کے زیور ایک اجنبی کے پاس کیوں چھوڑ جاتی۔ اس کے علاوہ اس کو مورفیا کے انجکشن لینے کی عادت ہے۔"

شہاب نے پوچھا۔ "نشہ ہوتا ہے ایک قسم کا؟"

خان نے جواب دیا "بہت ہی خطرناک قسم کا۔ شراب سے بھی بدتر!"
"اس کی عادت کیسے پڑی اُسے؟" شہاب نے میز پر سے پیپر ویٹ اٹھا کر دوات پر رکھ دیا۔

"آپریشن ہوا تو بگڑ گیا۔ درد شدت کا تھا۔ اس کا احساس کم کرنے کے لئے ڈاکٹر مورفیا کے انجکشن دیتے رہے۔ تقریباً دو مہینے تک بس عادت ہو گئی۔" ڈاکٹر خان نے مورفیا اور اس کے خطرناک اثرات پر ایک لکچر سا شروع کر دیا۔

ایک ہفتہ ہو گیا۔ شوبھا نہ آئی۔ شہاب واپس حیدرآباد چلا گیا تھا۔ ڈاکٹر خان زیور لے کر حنیف کے پاس آیا کہ چلو دے آئیں۔ دونوں نے گرانٹ کے نالے پر اس دلال کو بہت تلاش کیا۔ جو شہاب اور حنیف کو شوبھا کے مکان کے پاس لے گیا تھا۔ مگر وہ نہ ملا۔ حنیف کو اتنا معلوم تھا کہ گلی کون سی ہے۔ ڈاکٹر خان نے کہا "ٹھیک ہے ہم پتہ لگا لیں گے۔ یہ زیور میں اپنے پاس نہیں رکھنا چاہتا۔ چوری ہو گئے تو کیا کروں گا۔ وہ تو عجیب بے پروا عورت ہے۔"

دونوں ٹیکسی میں وہاں پہنچ گئے۔ ڈاکٹر خان کو حنیف نے بلڈنگ بتا دی اور کہا "میں نہیں جاؤں گا بھائی۔ تم تلاش کرو اسے۔"

ڈاکٹر خان اکیلا اس بلڈنگ میں داخل ہوا ایک دو آدمیوں سے پوچھا مگر شوبھا کا کچھ پتہ نہ چلا۔ نیچے سے لفٹ اوپر کو آئی تو ہوٹل کا چھوکرا پیالیاں اٹھائے باہر نکلا۔ خان نے اس سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ

سب سے نچلی منزل کے آخری فلیٹ پر چلے جاؤ۔ لفٹ کے ذریعہ سے
خان نیچے پہنچا۔ آخری فلیٹ کی گھنٹی بجائی۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک بڑھیا
عورت نے دروازہ کھولا۔ خان نے اُس سے پوچھا "شوبھا بائی ہیں؟"

بڑھیا نے جواب دیا "ہاں ہیں"

خان نے کہا "جاؤ اس سے کہو ڈاکٹر خان آئے ہیں"

اندر سے شوبھا کی آواز آئی "آئیے ڈاکٹر صاحب آئیے"

ڈاکٹر خان اندر داخل ہوا۔ چھوٹا سا ڈرائنگ روم تھا چمکیلے فرنیچر سے
بھرا ہوا۔ فرش پر قالین بچھے ہوئے تھے۔ بڑھیا دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ فوراً ہی
شوبھا کی آواز آئی "ڈاکٹر صاحب اندر آجائیے۔ میں باہر نہیں آسکتی"

ڈاکٹر خان دوسرے کمرے میں داخل ہوا۔ شوبھا چادر اوڑھے لیٹی تھی۔
خان نے اس سے پوچھا "کیا بات ہے؟"

شوبھا مسکرائی "کچھ نہیں ڈاکٹر صاحب تیل مالش کرا رہی تھی"

ڈاکٹر پلنگ کے پاس کرسی پر بیٹھ گیا۔ جیب سے رومال نکالا جس میں زیور
بندھے تھے کھول کر اسے پلنگ پر رکھ دیا "کب تک میں تمہارے ان زیوروں
کی حفاظت کرتا رہوں گا۔ تم ایسی گئیں کہ پھر ادھر کا رخ تک نہ کیا"

شوبھا ہنسی "مجھے بہت کام تھے۔ لیکن آپ نے کیوں تکلیف
کی میں خود آکے لے جاتی" پھر اس نے بڑھیا سے کہا "چائے منگاؤ۔ ڈاکٹر
صاحب کے لئے"

Don-ted By
Dr. RAJ BAHADUR GOUR

ڈاکٹر نے کہا "نہیں مجھے اب جانا ہے"

"کہاں ؟"

"ہسپتال"

"ٹیکسی میں آئے ہیں آپ ؟"

"ہاں"

"باہر کھڑی ہے ؟"

ڈاکٹر نے سر کے اشارے سے ہاں کی۔

"تو آپ چلئے میں آتی ہوں" یہ کہہ کر اس نے زیور تکیے کے نیچے رکھ دیئے اور رومال ڈاکٹر خان کو دیدیا۔ ڈاکٹر خاں، حنیف کے پاس پہنچا تو اس نے پوچھا۔ "مل گئی ؟"

ڈاکٹر مسکرایا "مل گئی۔ آ رہی ہے!"

پندرہ بیس منٹ کے بعد شوبھا نے تیزی سے ٹیکسی کا دروازہ کھولا اور اندر بیٹھ گئی۔

ڈاکٹر خان کے کمرے میں دیر تک فضول قسم کی شعر بازی ہوتی رہی۔ ہجر و وصال اور عشق و محبت کے بے شمار عامیانہ اشعار شوبھا نے سنائے اور انہیں اپنے نام سے منسوب کیا۔ ڈاکٹر خان اور حنیف نے خوب داد دی۔ شوبھا بہت خوش ہوئی اور کہنے لگی "یعقوب فیٹھ گھنٹوں مجھ سے نعر فنا کرتے تھے"

یعقوب فیٹھ وہ لکڑی والا سیٹھ تھا جس نے شوبھا کے لئے ایک فلم کمپنی کھولی تھی۔ ڈاکٹر خان اور حنیف ہنس پڑے شوبھا بھی ہنسنے لگی۔

ڈاکٹر خان اور شوبھا کی دوستی ہو گئی۔ شروع شروع میں تو وہ ہفتے

میں دوبارہ آتی تھی۔ اب قریب قریب ہر روز آنے لگی رات آتی صبح سویرے چلی جاتی۔ شام کو بلاناغہ مورفیا کا انجکشن لیتی۔ ڈاکٹر انجکشن لگانے سے پہلے اس کے بازو پر بے حس کرنے والی دوا لگا دیتا تھا یہ ٹھنڈی ٹھنڈی چیز اسے بہت پسند تھی۔

تین مہینے گزرے تو شوبھا جے پور جانے کے لئے تیار ہوئی۔ موٹر اپنی ڈاکٹر خان کے حوالے کر دی کہ وہ اس کا دھیان رکھے۔ ڈاکٹر اسے اسٹیشن پر چھوڑنے گیا — دیر تک گاڑی میں ایک دوسرے سے باتیں کرتے رہے۔ جب گاڑی چلنے لگی تو شوبھا نے ایک دم ڈاکٹر کا ہاتھ پکڑ کر کہا "مجھے کیوں ایک دم ایسا لگا ہے کہ کچھ ہونے والا ہے۔"

ڈاکٹر خان نے کہا "کیا ہونے والا ہے؟"

شوبھا کے چہرے سے وحشت برسنے لگی "معلوم نہیں میرا دل بیٹھا جا رہا ہے۔"

ڈاکٹر خان نے اسے دم دلاسا دیا۔ گاڑی چل دی، دور تک شوبھا کا ہاتھ ہلتا رہا۔

جے پور سے شوبھا کے دو خط آئے جن سے صرف اتنا پتہ چلتا تھا کہ وہ خیریت سے پہنچ گئی ہے، جب واپس آئے گی تو اس کے لئے بہت سے تحفے لائے گی۔ اس کے بعد ایک کارڈ آیا جس میں یہ لکھا تھا "میری اندھیری زندگی میں صرف ایک دیا تھا وہ کل خدا نے بجھا دیا۔ بھلا ہو اس کا!"

حنیف نے یہ الفاظ پڑھے تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ بھلا ہو

اس کا میں بے پناہ غم تھا۔

بہت عرصہ گزر گیا۔ شوبھا کا کوئی خط نہ آیا پورا ایک برس بیت گیا۔ ڈاکٹر عثمان کو اس کا کوئی پتہ نہ چلا۔ شوبھا اپنی موٹر اس کے حوالے کر گئی تھی۔ اس بلڈنگ میں گیا جس کی سب سے نچلی منزل میں وہ رہا کرتی تھی۔ فلیٹ پہ کوئی اور ہی قابض تھا۔ ایک دلال قسم کا آدمی۔ ڈاکٹر عثمان آخر تھک ہار کر خاموش ہو گیا۔ موٹر اس نے ایک گراج میں رکھوا دی۔

ایک دن حنیف گھبرایا ہوا ہسپتال میں آیا اس کا چہرہ زرد تھا۔ ڈاکٹر خان کو ڈیوٹی سے ہٹا کر وہ ایک طرف لے گیا۔ اور اس سے کہا "میں نے آج شوبھا کو دیکھا"

ڈاکٹر خان نے حنیف کا بازو پکڑ کر ایک دم پوچھا "کہاں؟"

"چوپاٹی پر۔ میں اسے بالکل نہ پہچانتا۔ کیونکہ وہ محض ہڈیوں کا ڈھانچہ تھی۔"

ڈاکٹر خان کھوکھلی آواز میں بولا "ہڈیوں کا ڈھانچہ۔"

حنیف نے سرد آہ بھری "شوبھا نہیں تھی اس کا سایہ تھا۔ آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئیں، بال پریشان اور گرد آلود۔ یوں چلتی تھی کہ اپنے آپ کو گھسیٹ رہی ہے، میرے پاس آئی اور کہا مجھے پانچ روپے دو۔ میں نے اس کو نہ پہچانا۔ پوچھا کیا کرو گی پانچ روپے لے کر؟ بولی مورفیا کا ٹیکہ لوں گی، ۔ ۔ ایک دم میں نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کے بالائی ہونٹ پہ زخم کا نشان موجود تھا۔ میں چلایا "شوبھا۔ اس نے تھکی ہوئی ویران آنکھوں سے مجھے دیکھا اور پوچھا کون ہو تم۔ میں نے کہا حنیف۔ اس نے جواب دیا۔

میں کسی حنیف کو نہیں جانتی۔ میں نے تمہارا ذکر کیا۔ کہ تم نے اسے بہت تلاش کیا۔ بہت ڈھونڈا۔ یہ سن کر اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ پیدا ہوئی اور کہنے لگی، اس سے کہنا مت ڈھونڈے مجھے۔ میری طرف دیکھو میں اتنی مدت سے اپنا کھویا ہوا لال ڈھونڈتی پھر رہی ہوں۔ یہ ڈھونڈنا بالکل بیکار ہے۔ کچھ نہیں ملتا۔ لاؤ پانچ روپے دو مجھے۔ میں نے اسے پانچ روپے دیئے اور کہا، اپنی موٹر تو لے جاؤ ڈاکٹر خان سے، وہ قہقہے لگاتی ہوئی چلی گئی۔"

خان نے پوچھا۔ "کہاں؟"

حنیف نے جواب دیا۔ "معلوم نہیں۔ کسی ڈاکٹر کے پاس گئی ہوگی۔"

ڈاکٹر خان نے بہت تلاش کیا مگر شوبھا کا کچھ پتہ نہ چلا۔

۱۲ر جون ۱۹۵۰ء

اجی ڈڈو

"مجھے مت ستائیے۔ خدا کی قسم، میں آپ سے کہتی ہوں، مجھے مت ستائیے۔"

"تم بہت ظلم کر رہی ہو آج کل!"

"جی ہاں بہت ظلم کر رہی ہوں۔"

"یہ تو کوئی جواب نہیں۔"

"میری طرف سے صاف جواب ہے اور یہ میں آپ سے کئی دفعہ کہہ چکی ہوں۔"

"آج میں کچھ نہیں سنوں گا۔"

"مجھے مت ستائیے۔ خدا کی قسم، میں آپ سے سچ کہتی ہوں مجھے مت ستائیے۔

میں چلانا شروع کر دوں گی۔"

"آہستہ بولو بچیاں جاگ پڑیں گی۔"

"آپ تو بچیوں کے ڈھیر لگانا چاہتے ہیں۔"

"تم ہمیشہ مجھے یہی طعنہ دیتی ہو۔"

"آپ کو کچھ خیال تو ہونا چاہیئے۔ میں تنگ آ چکی ہوں۔"

"درست ہے ــــ لیکن ــــ"

"لیکن ویکن کچھ نہیں!"

"تمہیں میرا کچھ خیال نہیں۔ اصل میں اب تم مجھ سے محبت نہیں کرتیں۔ آج سے آٹھ برس پہلے جو بات تھی وہ اب نہیں رہی۔ تمہیں اب میری ذات سے کوئی دلچسپی ہی نہیں رہی۔"

"ہاں"

"وہ کیا دن تھے جب ہماری شادی ہوئی تھی تمہیں میری ہر بات کا کتنا خیال رہتا تھا۔ ہم باہم کس قدر شیر و شکر تھے مگر اب تم کبھی سونے کا بہانہ کر دیتی ہو کبھی تھکاوٹ کا عذر پیش کر دیتی ہو۔ اور کبھی دونوں کان بند کر لیتی ہو۔ کچھ سنتی ہی نہیں۔"

"میں کچھ سننے کے لئے تیار نہیں!"

"تم ظلم کی آخری حد تک پہنچ گئی ہو۔"

"مجھے سونے دیجئے۔"

"سو جائیے۔ مگر میں ساری رات کروٹیں بدلتا رہوں گا۔ آپ کی بلا سے!"

"آہستہ بولئے۔ ساتھ ہمسائے بھی ہیں۔"

"ہوا کریں۔"

"آپ کو تو کچھ خیال ہی نہیں۔ سنیں گے تو کیا کہیں گے۔"

"کہیں گے کہ اس غریب آدمی کو کیسی کڑی بیوی ملی ہے۔"

"لو وہ ہوا۔"

"آہستہ بولو۔ دیکھو بچی جاگ پڑی!"

"اللہ اللہ۔ اللہ جی اللہ۔ اللہ اللہ۔ اللہ جی اللہ۔ سو جاؤ، بیٹے سو جاؤ۔ اللہ، اللہ۔ اللہ جی اللہ۔ خدا کی قسم آپ بہت تنگ کرتے ہیں۔ دن بھر کی تھکی ماندی کو سونے تو دیجئے!"

"اللہ اللہ۔ اللہ جی اللہ۔ اللہ اللہ۔ اللہ جی اللہ۔ تمہیں اچھی طرح سُلانا بھی نہیں آتا۔"

"آپ کو تو آتا ہے نا۔ سارا دن آپ گھر میں رہ کر یہی تو کرتے رہتے ہیں۔"

"بھئی میں سارا دن گھر میں کیسے رہ سکتا ہوں۔ جب فرصت ملتی ہے آجاتا ہوں اور تمہارا ہاتھ بٹا دیتا ہوں۔"

"میرا ہاتھ بٹانے کی آپ کو کوئی ضرورت نہیں۔ آپ مہربانی کر کے گھر سے باہر اپنے دوستوں ہی کے ساتھ گلچھرّے اُڑایا کریں۔"

"گلچھرّے!"

"میں زیادہ باتیں نہیں کرنا چاہتی۔"

"اچھا دیکھو، میری ایک بات کا جواب دو۔"

"خدا کے لئے مجھے تنگ نہ کیجئے۔"

"کمال ہے میں کہاں جاؤں۔"

"جہاں آپ کے سینگ سمائیں، چلے جائیے۔"

"لو اب ہمارے سینگ بھی ہو گئے۔"

"آپ چُپ نہیں کریں گے۔"

"نہیں۔ میں آج بولتا ہی رہوں گا۔ خود سوؤں گا نہ تمہیں سونے دوں گا۔"

"سچ کہتی ہوں میں پاگل ہو جاؤں گی۔ لوگو یہ کیسا آدمی ہے۔ کچھ سمجھتا ہی نہیں ہے۔ بس ہر وقت۔ ہر وقت۔ ہر وقت ....."

"تم ضرور تمام بچیوں کو جگا کر رہو گی۔"

"نہ پیدا کی ہوتیں اتنی!"

"پیدا کرنے والا میں تو نہیں ہوں۔ یہ تو اللہ کی دین ہے۔ اللہ، اللہ۔ اللہ جی اللہ، اللہ۔ اللہ جی، اللہ۔"

"بچی کو اب میں نے جگایا تھا؟"

"مجھے افسوس ہے!"

"افسوس ہے کہہ دیا۔ چلو چھٹی ہوئی۔ گلا پھاڑ پھاڑ کر چلاتے چلے جا رہے ہیں۔ ہمسائیگی کا کچھ خیال ہی نہیں۔ لوگ کیا کہیں گے۔ اس کی کوئی پروا ہی نہیں۔ خدا کی قسم میں عنقریب ہی دیوانی ہو جاؤں گی!"

"دیوانے ہوں تمہارے دشمن۔"

"میری جان کے دشمن تو آپ ہیں۔"

"تو خدا مجھے دیوانہ کرے۔"

"وہ تو آپ ہیں!"

"میں دیوانہ ہوں مگر تمہارا۔"

"اب چونچلے نہ گھارئیے۔"

"تم تو نہ یوں مانتی ہو نہ دوں۔"

"میں سونا چاہتی ہوں۔"

"سو جاؤ، میں پڑا بکواس کرتا رہوں گا۔"

"یہ بکواس کیا اشد ضروری ہے۔"

"ہے تو سہی۔ ذرا ادھر دیکھو۔"

"میں کہتی ہوں مجھے تنگ نہ کیجئے۔ میں رو دوں گی۔"

"تمہارے دل میں اتنی نفرت کیوں پیدا ہو گئی۔ میری ساری زندگی تمہارے لئے ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ مجھ سے کوئی خطا ہوئی ہو تو بتاؤ۔"

"آپ کی تیس خطائیں یہ سامنے پلنگ پر پڑی ہیں۔"

"یہ تمہارے کوسنے کبھی ختم نہیں ہوں گے۔"

"آپ کی ہٹ کب ختم ہو گی؟"

"لو بابا میں تم سے کچھ نہیں کہتا۔ سو جاؤ۔ میں نیچے چلا جاتا ہوں۔"

"کہاں؟"

"جہنم میں"

"یہ کیا پاگل پن ہے۔ نیچے اتنے مچھر ہیں۔ پنکھا بھی نہیں۔ سچ کہتی

ہوں، آپ بالکل پاگل ہیں۔ میں نہیں جانے دوں گی آپ کو۔"

"میں یہاں کیا کروں گا۔ مجھ میں پنکھا نہیں ہے، ٹھیک ہے۔ میں نے زندگی کے بُرے دن بھی گزارے ہیں۔ تن آسان نہیں ہوں۔ سو جاؤں گا صوفے پر۔"

"سارا وقت جاگتے رہیں گے۔"

"تمہاری بلا سے۔"

"میں نہیں جانے دوں گی آپ کو۔ بات کا بتنگڑ بنا دیتے ہیں۔"

"نہیں میں جاؤں گا۔ مجھے جانے دو۔"

"کیسی باتیں منہ سے نکالتے ہیں۔ خبردار جو آپ گئے!"

"مجھے یہاں نیند نہیں آئے گی۔"

"نہ آئے۔"

"یہ عجیب منطق ہے۔ میں کوئی لڑ جھگڑ تو نہیں مار رہا۔"

"لڑائی جھگڑا کیا ابھی باقی ہے۔ خدا کی قسم آپ کبھی کبھی بالکل بچوں کی سی باتیں کرتے ہیں۔ اب یہ خبط سر میں سمایا ہے کہ نیچے گرمی اور مچھروں میں جا کر سوؤں گا۔ کوئی اور ہوتی تو پاگل ہو جاتی۔"

"تمہیں میرا بڑا خیال ہے۔"

"اچھا بابا نہیں ہے۔ آپ چاہتے کیا ہیں؟"

"اب سیدھے راستے پر آئی ہو۔"

"چلئے ہٹئے۔ میں کوئی راستہ واستہ نہیں جانتی۔ منہ دھو کے

رکھئے اپنا۔"

منہ صبح دھویا جاتا ہے۔ لو، اب من جاؤ۔"

"توبہ!"

"ساڑھی پر وہ بارڈر لگ کر آ گیا؟"

"نہیں!"

"عجب اُلّو کا پٹھا ہے درزی۔ کہہ رہا تھا آج ضرور پہنچا دے گا۔"

"لے کر آیا تھا، مگر میں نے واپس کر دی۔"

"کیوں؟"

"ایک دو جگہ جھول تھے۔"

"اوہ۔ اچھا، میں نے کہا، کل "برسات" دیکھنے چلیں گے۔ میں نے پاس کا بندوبست کر لیا ہے۔"

"کتنے آدمیوں کا؟"

"دو کا۔ کیوں؟"

"باجی بھی جانا چاہتی تھیں۔"

"ہٹاؤ باجی کو پہلے ہم دیکھیں گے پھر اس کو دکھا دیں گے۔ پہلے ہفتے میں پاس بڑی مشکل سے ملتے ہیں۔ چاندنی رات میں تمہارا بدن کتنا چمک رہا ہے۔"

"مجھے تو اس چاندنی سے نفرت ہے۔ کم بخت آنکھوں میں گھستی ہے۔ سونے نہیں دیتی۔"

"تمہیں تو بس ہر وقت سونے ہی کی پڑی رہتی ہے۔"

"آپ کو بچیوں کی دیکھ بھال کرنا پڑے تو پھر پتہ چلے۔ آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو جاتے۔ ایک کے کپڑے بدلو تو دوسری کے میلے ہو جاتے ہیں۔ ایک کو سلاؤ۔ دوسری جاگ پڑتی ہے، تیسری نعمت خانے کی نمائندگی میں مصروف ہوتی ہے۔"

"دو نوکر گھر میں موجود ہیں۔"

"نوکر کچھ نہیں کرتے۔"

"تو انہیں نکال باہر کرو۔"

"آہستہ بولئے۔ دیکھئے چھوٹی کیسے چونکی ہے۔"

"معاف کر دینا۔ ذرا ہاتھ سے تھپکا دو۔"

"منجھلی بھی تڑپ رہی ہے۔"

"پیشاب کرا دیا تھا اسے۔"

"جی ہاں!"

"پھر کیا وجہ ہے؟"

"گرمی آج کچھ زیادہ ہے۔ آپ پرے ہٹ جائیے۔"

"نہیں نہیں۔"

"آخر ہار مجھے ہی ماننی پڑتی ہے۔"

"تمہاری ہار ہار نہیں جیت ہوتی ہے۔ اللہ بہتر جانتا ہے مجھے تم سے کتنی محبت ہے!"

"اپنی محبت آپ اسی وقت جتایا کرتے ہیں۔"

"لو بھئی، اور کیا سر بازار تم سے محبت کیا کروں۔ ادھر دیکھو، میری طرف"

"آپ اپنی کر کے رہیں گے۔"

"میری جان جو ہو تمہیں تم۔"

"میں نے کہا ہٹئے۔"

"کیا ہوا؟"

"دیکھتے نہیں بڑی اٹھ کر بیٹھی ہوئی ہے۔"

"اوہ!"

"سُنا نہیں آپ نے؟"

"کیا؟"

"کہہ رہی ہے ابھی ڈوڈو!"

"ہاں ہاں سنا ہے۔ دے اسے دودھ۔"

"میں نیچے بھول آئی ہوں۔"

"نیچے؟"

"ہاں، نعمت خانے میں۔ جائیے لے آئیے۔"

"لے آؤں نیچے سے؟"

"جلدی جائیے ورنہ رونا شروع کر دیگی۔"

"جاتا ہوں!"

"میں نے کہا سنئے ۔ آگ جلا کر ذرا کنکنا کر لیجئے گا دودھ ۔"
"اچھا اچھا ۔ سن لیا ہے !"

۱۳ر جون ۱۹۵۰ء

★ بادشاہت کا خاتمہ	افسانے	سعادت حسن منٹو	۱۵/۰۰ روپے
★ جنازے	افسانے	سعادت حسن منٹو	۱۵/۰۰ "
★ دشت کا بھیڑیا	تاریخی ناول	الیاس سیتاپوری	۱۵/۰۰ "
★ آتش پارے اور سیاہ حاشیے	افسانے	سعادت حسن منٹو	۱۸/۰۰ "
★ ٹھنڈا گوشت	افسانے	سعادت حسن منٹو	۱۸/۰۰ "
★ ٹوٹی لکیر	ناول	انیس مرزا	۲۷/۰۰ "
★ بانجھ	افسانے	سعادت حسن منٹو	۲۴/۰۰ "
★ بغیر عنوان کے	ناول	سعادت حسن منٹو	۱۱/۰۰ "
★ کاش بہشت	تاریخی ناول	الیاس سیتاپوری	۱۳/۰۰ "
★ گنجے فرشتے	خاکے	سعادت حسن منٹو	۲۴/۰۰ "
★ تین عورتیں	طنزیہ	سعادت حسن منٹو	۹/۰۰ "
★ لذتِ سنگ	افسانے	سعادت حسن منٹو	۱۱/۰۰ "
★ تلخ، ترش اور شیریں	طنز و مزاح	سعادت حسن منٹو	۱۵/۰۰ "
★ پھندنے	افسانے	سعادت حسن منٹو	۱۴/۰۰ "
★ فرشتہ محبت کا	ناول	عذرا بانو عرشی	۱۰/۰۰ "
★ دھواں	افسانے	سعادت حسن منٹو	۱۲/۵۰ "
★ خمارِ گندم	طنز و مزاح	ابن انشا	۱۲/۵۰ "
★ اردو کی آخری کتاب	طنز و مزاح	ابن انشا	۱۲/۵۰ "
★ عرب اسرائیل جنگ کی خفیہ باتیں		محمد حسنین ہیکل	۱۰/۰۰ "